مطبوعاتِ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

اسلام کا نظریۂ تعلیم

ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم۔ اے۔ پی ایچ ڈی

★

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور

(انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر، کلب روڈ، لاہور)

طبع دوم :- ۱۰۰۰

۱۹۵۵ء

ایک روپیہ چار آنے

ماہنامۂ

ثقافت لاہور

پاکستان میں اپنی نوعیت کا واحد رسالہ ہے۔ اور ادارہ ثقافت اسلامیہ کا ترجمان ہے۔ اور اس کے عمومی مباحث یہ ہوتے ہیں:۔

* معاشرے کے حقیقی مسائل پر اصولی بحث۔
* معاشرے کے بنیادی اقدار اور دین صحیح کی پیشکش۔
* دین کی روشنی میں حیات جدیدہ کی تشکیل۔
* وحدت فکر اور وحدت انسانی کی دعوت۔
* اسلاف کے گراں قدر خدمات اور علمی سرمائے سے استفادہ۔
* متفرقات ——————— ضخامت ۸۰ صفحات

سالانہ چندہ آٹھ روپے قیمت فی پرچہ بارہ آنے

ملنے کا پتہ:۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور

اے بعشقِ دیگراں دل باختہ
آبروئے خویش را نشناختہ

اِسلام کا نظریۂ تعلیم

ڈاکٹر محمد رفیع الدین۔ ایم اے۔ پی، ایچ، ڈی
(سابق اِدارۂ ثقافتِ اسلامیہ)

مطبوعات ادارۂ ثقافتِ اِسلامیہ۔ لاہور
پاکستان

۱۹۵۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہمارے اکثر ماہرینِ تعلیم کا خیال ہے کہ مذہب کو تعلیم سے الگ رہنا چاہیئے :-

مذہب اور تعلیم کا افتراق مغربی تصور ہے

اگر ان میں سے بعض علمی طور پر مذہب اور تعلیم کے اتحاد کی حمایت بھی کرتے ہیں۔ تو فقط اس خیال سے کہ مذہب کے معاملہ میں عوام کے جذبات اور رجحانات کی مخالفت ممکن نہیں ورنہ ان کو یقین ہوتا ہے۔ کہ اصولی طور پر مذہب کا تعلیم سے کوئی علاقہ نہیں۔ یقیناً انہوں نے اپنا یہ خیال مغرب کے ماہرینِ تعلیم سے مستعار لیا ہے کیونکہ مغرب کے ماہرینِ تعلیم بھی اصولی طور پر مذہب اور تعلیم کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے کے حامی ہیں۔ چنانچہ مغرب کے تعلیمی اداروں میں کہیں بھی مذہب نصاب تعلیم کا جزو نہیں۔

مغربی فکر کا تتبع ہمارے لئے کوئی نئی بات نہیں۔ گو یہ صحیح ہے کہ ہر مغربی تصور غلط نہیں ہوتا۔ لیکن مدت سے ہماری یہ حالت ہے کہ ہم مغرب کے سیاسی اور علمی تفوق سے مرعوب ہیں اور مغربی افکار و آرا کو تنقید اور تحقیق کے بغیر قبول کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ شاید اس میں ہمارا قصور بھی نہیں کیونکہ مغرب کے افکار و آرا ایک سیلاب کی مانند ہیں جس میں دنیا کی ہر قوم بے اختیار بہتی چلی جا رہی ہے اور ہم بھی ان کے

ساتھ اس سیلاب میں بے اختیار بہہ رہے ہیں۔

لیکن تعلیم کا معاملہ اس قدر اہم ہے کہ ہمیں کچھ سنبھلنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اور سوچنا چاہیئے۔ کہ اگر ہم اس ملک میں اپنا نظام تعلیم مرتب کرتے ہوئے مذہب کو تعلیم سے الگ رکھیں تو کیا خالص علمی اور عقلی نقطۂ نظر سے ہمارے پاس اس کے لئے کوئی وجہ جواز بھی موجود ہوگی۔ یا ہم فقط مغربی حکماء کی تقلید کر رہے ہونگے۔ اس خیال سے کہ یہ لوگ جو بات کہتے ہیں صحیح ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہم مذہب اور تعلیم کے افتراق کے اصول کو سارے تعصبات سے الگ ہو کر محض علم اور عقل کے معیار پر پرکھنے کی کوشش کریں تو ہمیں نظر آئیگا کہ یہ اصول قطعاً غلط ہے اور مغربی قومیں اسے فقط اپنے مخصوص حالات اور اپنی مخصوص تاریخی اور ذہنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کی بنا پر ایک بلند پایہ علمی اصول سمجھنے اور عملی طور پر اسے اختیار کرنے کے لئے مجبور ہوئی ہیں۔

نظریہ تعلیم فطرت انسانی کے نظریہ کا ایک جزء ہے

ہمارے یہ ماہرین تعلیم اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ کہ فلسفۂ تعلیم علم کا کوئی الگ شعبہ نہیں جو آزادانہ علمی تحقیق اور عقلی استدلال کی بنا پر قائم کیا گیا ہو۔ بلکہ وہ فلسفۂ اخلاق اور فلسفۂ سیاست کی طرح ہمارے نظریۂ انسان و کائنات کا ایک عکس ہوتا ہے لوگ انسان اور کائنات کا جو تصور قائم کرتے ہیں۔ اپنا نظریہ تعلیم بھی اسی سے اخذ کرتے ہیں۔ وہ انسانی زندگی کا جو مقصد قرار دیتے ہیں اپنی تعلیم کا مقصد بھی وہی تجویز کرتے ہیں۔ ہر قوم کا نظریہ زندگی الگ ہوتا ہے لہٰذا ہر قوم کا نظریہ تعلیم بھی الگ ہوتا ہے۔ چونکہ نظریات عالم بہت سے ہیں لہٰذا ضروری ہے، کہ نظریات تعلیم بھی بہت سے ہوں۔ جس طرح نظریات زندگی سب صحیح نہیں ہو سکتے۔ بلکہ ان میں سے صرف ایک صحیح ہو سکتا ہے اور وہ وہی ہوگا۔ جو صحیح نظریہ زندگی پر مبنی ہوگا جبتک ہمارا نظریہ زندگی صحیح نہ ہو۔ ہم زندگی کا صحیح مقصد نہیں جان سکتے، اور نہ تعلیم کا صحیح مقصد معین کر سکتے ہیں۔ دراصل نظریۂ زندگی۔ نظریۂ کائنات۔ مقصد زندگی اور مقصد تعلیم ایک

ہی چیز کے مختلف نام ہیں۔ جسے ہم کبھی مختصر طور پر بیان دیتے ہیں اور کبھی مفصل طور پر اور ان کا عقدہ حقیقت انسان کے علم سے وا ہوتا ہے اگر ہم جان لیں کہ انسان کی فطرت کیا ہے تو گویا ہم نے جان لیا کہ صحیح نظریہ کائنات۔ صحیح نظریہ زندگی۔ صحیح مقصد زندگی یا صحیح مقصد تعلیم کیا ہے تو پھر کیا فطرت انسانی کو ٹھیک طرح سے سمجھنے کے لئے ہم مغرب کے حکیموں اور داناؤں کو اپنا رہنما بنائیں؟ ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں بلکہ اگر مغرب کے سارے دانا اور حکیم اس معاملہ میں ہماری راہ نمائی کر سکیں تو ہم خوشی سے ان کی راہ نمائی قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن وہ بیچارے تو خود شاکی ہیں کہ فطرت انسانی کے متعلق ان کی واقفیت خطرناک حد تک محدود ہے میکڈوگل (McDougall) جیسا نامور ماہر نفسیات لکھتا ہے۔

"انسان کی فطرت کے متعلق ہماری عدم واقفیت نے آج تک تمام حیاتی علوم کی نشوونما کو روکا ہوا ہے یہ علوم ہمارے زمانہ کی ایک ایسی ضرورت کا درجہ رکھتے ہیں جس کے لئے دنیا چلا رہی ہے ان کے بغیر ہماری تہذیب زوال بلکہ فنا کے شدید خطرہ سے دوچار ہے،

مغربی حکماء کی فطرت انسانی سے لاعلمی۔

میرا دعایہ ہے کہ اپنی تہذیب کے ترازو کو برابر رکھنے کے لئے ہمیں انسان کی فطرت اور سوسائٹی کی زندگی کے متعلق اس سے بہت زیادہ علم (ایک منظم علم) کی ضرورت ہے جو ہمیں اس وقت حاصل ہے"

پس ہماری تہذیب کی غیر متیقن اور بڑھتی ہوئی خطرناک حالت کا صرف ایک ہی علاج ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمیں سرعت کے ساتھ اجتماعی علوم کو سچ مچ کے علوم کی شکل دینا چاہیئے اور اس غرض کے لئے پہلے انسان کی فطرت اور اس کے اعمال و افعال کے متعلق ایک منظم واقفیت بہم پہنچانا چاہیئے۔

پس علمی صورت میں اس کا علاج کیا ہے میں اس سوال کے مختصر جواب کے طور پر یہ بتاؤں گا کہ اگر میں ڈکٹیٹر بن جاؤں تو کیا کروں ...... میں ہر ممکن طریق سے اپنی قوم کے ذہین ترین

افراد کو مادی علوم سے ہٹا کر انسانی اور اجتماعی علوم کی جستجو پر مقرر کردوں،

امریکہ کا ایک مشہور سائنسدان ڈاکٹر روگر جے ویلیمز (Dr. Roger J. Williams)

دنیا بھر میں سائینسدانوں کی سب سے بڑی انجمن۔ اے۔ اے۔ اے ایس A. A. A. S.

میں تقریر کرتے ہوئے کہتا ہے۔

پچھلے ایک سو سال میں سائینس نے علم وصنعت میں ایک انقلاب پیدا کیا ہے اب اسے انسانی مسائل کا حل تلاش کرنا چاہیئے، سائنس دان سوسائٹی کے سالمہ یعنی فرد انسانی کے متعلق وہ معلومات حاصل نہیں کرسکے جو انہوں نے مادہ کے سالمہ کے متعلق بہم پہنچائی ہیں۔ اب ہمیں ساری توجہ اس حقیقت کی دریافت میں صرف کرنا چاہیئے کہ انسان کیا ہے آج ہم اپنی جس کمی کو سب سے زیادہ محسوس کر رہے ہیں۔ وہ اس بات کی لاعلمی ہے کہ لوگ کیا ہیں۔ سچ سچ کے انسان جو اس کرۂ زمین پر لیتے ہیں کیا ہیں. آج ہماری تہذیب کو سالمہ کے بم سے یا جراثیم کی جنگ سے فنا ہونے کا خطرہ نہیں۔ بلکہ ہم اس کے لئے خود ایک خطرہ بنے ہوئے ہیں اگر ہم اپنی بدبختی کے لئے اٹیم بم کو مجرم ٹھہرائیں تو ہم اس نادان لڑکے کی طرح ہونگے، جو بائیسکل سے گر جانے کے لیے اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے بائیسکل کو جوتے کی ٹھوکر لگاتا ہے اگر ہماری تہذیب مٹ گئی۔ تو وہ آلات یا اسلحہ جو انسان کام میں لائیگا۔ اس کی بربادی کا موجب نہ ہوں گے۔ بلکہ انسان خود ہی اپنی ہلاکت کا موجب ہوگا۔

یورپ کے محققین ہمیں ریاضیات طبعیات اور حیاتیات ایسے علوم میں بیشک

مقصد تعلیم کے تعین کے مسئلہ میں حکمائے مغرب کی پریشان خیالی۔

کچھ رہنمائی کرسکتے ہیں لیکن انسانی اور اجتماعی علوم جن کی تدوین اور تنظیم کا دارومدار فطرتِ انسانی کے صحیح نظریہ پر ہے اور جن میں فلسفہ تعلیم بھی شامل ہے ان کے اپنے ہی اعتراف کے مطابق ان کی دسترس سے باہر ہیں جب یہ لوگ انسان کی حقیقت کے متعلق واضح طور پر کچھ نہیں جانتے تو وہ کیونکر جان سکتے ہیں۔ کہ انسان کی زندگی کا مقصد یا تعلیم کا مقصد کیا ہے اور جب ان کو تعلیم کا مقصد ہی معلوم نہ ہو۔

تو تعلیمی معاملات کے متعلق ان کی رائے کی وقعت کیا ہو سکتی ہے اور ہمارے لئے کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ ہم ان کی رائے کو وقیع سمجھیں۔

یورپ کے حکمائے تعلیم نے مقصد تعلیم کے متعلق جو رائے زنی کی ہے اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس موضوع پر ان کے خیالات کس قدر منتشر ہیں۔

ان میں سے ایک کہتا ہے کہ تعلیم کا مقصد سیرت کی تعمیر ہے دوسرا کہتا ہے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو ایک مکمل زندگی بسر کرنے کے لئے تیار کیا جائے تیسرے کے خیال کے مطابق اس کا مقصد ایک تندرست جسم میں ایک تندرست روح پیدا کرنا ہے، چوتھے کی رائے کے مطابق تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ انسان کی فطرت کے اعلیٰ ترین ممکنات کو ظہور میں لایا جائے۔

لیکن جب پوچھا جاتا ہے کہ سیرت کی تعمیر کس طرح سے ہوتی ہے اور تعمیر شدہ سیرت کے لوازمات کیا ہیں یا ایک مکمل زندگی کسے کہتے ہیں اور اس کے بسر کرنے کے طریقے کیا ہیں۔ ایک تندرست جسم میں ایک تندرست جان کس طرح سے پیدا ہوتی ہے اور ایک تندرست جان سے مراد کیا ہے۔ یا انسان کی فطرت کے اعلیٰ ترین ممکنات کیا ہیں اور ان کا ظہور کس طرح ہوتا ہے تو ان کے جوابات ایک دوسرے سے اس قدر مخالف ہوتے ہیں کہ کوئی کچھ نہیں سمجھ سکتا۔ کہ آخر تعلیم کا مقصد کیا قرار دیا جائے ڈاکٹر کیٹنگ (Dr. Keatinge) سچ کہتا ہے کہ تعلیم کے مقصد کا تعین کرنے کی یہ تمام کوششیں بے فائدہ ہیں کیونکہ ہر شخص ان کی طرف جو مطلب چاہے منسوب کر لیتا ہے۔

سر پرسی نن کی تعریف کے نقائص:-

انگلستان کے ایک نامور ماہر تعلیم سر پرسی نن (Sir Percy Nunn) نے آخر اپنی مشہور کتاب ایجوکیشن اٹس ڈیٹا اینڈ فرسٹ پرنسپلز (Education : its date and first principles). میں کوشش کی۔ کہ وہ مقصد تعلیم کی ان تمام تعریفوں سے بالاتر ہو کر کوئی ایسی تعریف کرے جو ان کے نقائص سے مبرا ہو

چنانچہ بڑی سوچ بچار کے بعد اس نے جو تعریف کی وہ یہ تھی۔ کہ تعلیم کا مقصد انسان کی انفرادیت (individuality) کی آزادانہ نشو و نما ہے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو سر پرسی نن کی یہ تعریف بھی ایسی ہی بیکار اور مہمل ہے جیسی کہ دوسری اوپر بیان کی ہوئی تعریفیں۔ اس لئے کہ سر پرسی نن اپنی ساری کتاب میں کہیں نہیں بتاتا۔ کہ انفرادیت سے اسکی مراد کیا ہے اور انفرادیت کی آزادانہ نشو و نما کیونکر ہوتی ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ انگریز اور ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ روسی کی انفرادیت کی نشو و نما ایک جیسی ہوئی ہے اگر ایک جیسی ہوئی ہے تو پھر اسکی وجہ کیا ہے کہ نیکی۔ فرض شناسی۔ انصاف۔ آزادی، سچائی، اور اس جیسی دوسری اقدار حیات کے متعلق دونوں کے نقطہ ہائے نظر میں بعد المشرقین موجود ہے۔ یہاں تک کہ دونوں میں سے ہر ایک دوسرے کو نیکی۔ فرض شناسی۔ انصاف۔ آزادی۔ اور سچائی کے اوصاف سے بے بہرہ سمجھتا ہے اگر ان کی انفرادیت کی نشو و نما ایک جیسی نہیں ہوئی تو فرق آکر کہاں پڑتا ہے اور کیوں دونوں میں سے ہر ایک دوسرے پر الزام رکھیگا کہ اس کی انفرادیت کی نشو و نما آزادانہ طور پر نہیں ہوئی اشتراکی کہتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام میں حکمران طبقہ کے سوا باقی سب غلام ہوتے ہیں اور اسی طرح سے سرمایہ دار کہتے ہیں کہ اشتراکی نظام میں حکمران طبقہ کے سواء باقی سب لوگ غلام ہوتے ہیں۔ اگر یہ اصول صحیح تسلیم کر لیا جائے (جیسا کہ وہ فی الواقعہ صحیح اور قابل تسلیم ہے)، کہ ہر آزاد انسان اپنے مقصد کے حصول کے لئے اپنی مرضی سے اپنے آپ پر پابندیاں عائد کرتا ہے اور مرضی سے عائد کی ہوئی پابندیاں اس کی آزادی میں خلل پیدا نہیں کرتیں۔ تو پھر اس بات کا فیصلہ کرنے کے لئے ہمارے پاس کیا اصول ہے کہ سچی آزادی کس کی ہے، اور جھوٹی آزادی کس کی ہے، سر پرسی نن اس کے متعلق کچھ نہیں کہتا۔

سر پرسی نن یہ تسلیم کرتا ہے کہ جب تک ہم زندگی کا نصب العین معین نہ کریں۔ ہم تعلیم کا نصب العین معین نہیں کر سکتے، اس سے ہم امید کر سکتے تھے، کہ وہ ہمیں زندگی کا اور تعلیم کا کوئی ایسا نصب العین بتائیگا جس سے ماہر تعلیم کو صحیح راہنمائی حاصل ہو سکے گی۔ اور جو انفرادیت کی

اس آزادانہ نشوونما کا ضامن ہوگا جس کا وہ خواہشمند ہے۔ لیکن زندگی یا تعلیم کا کوئی صحیح نصب العین معین کرنے کی بجائے وہ ایک ایسی بات کہتا ہے جو اس کی شہرت کے ایک ماہر تعلیم کی شایان شان نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ نہ تو کوئی زندگی کا مخصوص نصب العین ہونا چاہیئے اور نہ ہی تعلیم کا بلکہ ہر فرد بشر آزاد ہے کہ اپنی زندگی اور اپنی تعلیم کے لئے جو نصب العین چاہے اختیار کرے چنانچہ وہ لکھتا ہے۔

"تمام اشخاص کے لئے تعلیم کا کوئی ایسا نصب العین مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ جو زندگی کے کسی خاص نصب العین کے ماتحت ہو۔ کیونکہ دنیا میں اتنے ہی نصب العین ہیں جتنے کہ اشخاص"۔

مصنف کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر تعلیم کا کوئی مخصوص نصب العین مقرر کیا گیا تو اس سے طالب علم کی آزادی میں فرق آئے گا اور اسکی انفرادیت کی آزادانہ نشوونما نہ ہو سکیگی۔ لیکن ہم اس سے پوچھتے ہیں کہ کیا کسی نظام تعلیم میں یہ ممکن ہے کہ طالب علم کو ہر ایک نصب العین کے اثر سے محفوظ رکھا جائے۔ ہر نظام تعلیم کسی قوم سے تعلق رکھتا ہے کیا دنیا میں کوئی قوم ایسی ہے کہ جس کے افراد کا کوئی مشترک نصب العین نہ ہو جس کے افراد میں سے ہر ایک اپنا اپنا الگ نصب العین رکھتا ہو اگر کوئی قوم ایسی ہے تو وہ افراد کے اتحاد کے بغیر وجود میں نہیں آئی، تو پھر وہ کون سا تصور یا عقیدہ ہے جو اس کے افراد کو متحد اور منظم کر کے اسے ایک قوم کی شکل دیتا ہے اور ان کے فکر و عمل کے تمام شعبوں میں وحدت پیدا کرتا ہے اگر کوئی عقیدہ ایسا ہے تو وہی ان کی زندگی اور ان کی تعلیم کا نصب العین ہے اور اگر ان کے ہاں ایسا تصور یا عقیدہ کوئی نہیں تو پھر ظاہر ہے کہ وہ قوم ایک قوم نہیں ہوگی بلکہ ایسے افراد کی ایک بھیڑ ہوگی جو زندگی کے کسی شعبہ میں متحد نہ ہو سکتے ہوں۔ لیکن افراد کی ایسی بھیڑ دنیا میں کہیں موجود نہیں اور نہ ہو سکتی ہے۔ جونہی کہ انسان حیوانی بربریت کی سطح سے بلند ہو کر انسانی تہذیب کی سطح پر قدم رکھتا ہے اور اپنے ہمخیال اور ہم عقیدہ لوگوں سے مل کر ایک

ایک مخصوص نصب العین کی تعلیم سے نجات نہیں۔

جماعت بناتا ہے۔ نصب العین حیات کی بنا پر جماعت بندی کرنا انسان کی فطرت ہے، یہی وجہ ہے کہ ہمیں دنیا میں نصب العینی جماعتیں نظر آتی ہیں۔ نصب العینی افراد نظر نہیں آتے جب ہر قوم ایک مخصوص نصب العین کے ماتحت اپنی ساری زندگی بسر کرتی ہے تو کس طرح سے ممکن ہے کہ وہ کوئی ایسا نظامِ تعلیم کھڑا کرے جو کسی نصب العین حیات کی پیداوار نہ ہو۔ ایسا نظام تعلیم اس کی کونسی ضرورت کو پورا کرے گا۔

ہر نظامِ تعلیم ہمیشہ ایک بڑے نظام کا جزو ہوتا ہے جس کے بغیر اور جس سے الگ وہ جزو قائم ہی نہیں رہ سکتا اور یہ نظام ریاست ہوتی ہے اور ہر ریاست ایک مخصوص نصب العین حیات پر مبنی ہوتی ہے۔ ورنہ وہ وجود میں آ ہی نہیں سکتی۔ لہذا اگر کسی مخصوص نصب العین کو براہ راست اور جان بوجھ کر نظام تعلیم میں داخل نہ بھی کیا جائے تو پھر بھی وہ ایک مخصوص نصب العین پر قائم ہو جاتا ہے اور وہ وہی نصب العین ہوتا ہے جو اس کے بنانے اور چلانے والوں کا نصب العین اور ان کی قوم کا نصب العین ہوتا ہے اور پھر وہی نصب العین استادوں۔ پروفیسروں مدرسہ کے منیجروں۔ ہیڈ ماسٹروں۔ پرنسپلوں۔ انسپکٹروں، ڈائرکٹروں اور نصاب کے مؤلفوں کی ذہنیت کے ذریعہ سے پہلے مدرسہ کی ساری فضا پر اور پھر اس کے ذریعہ سے طالب علم کے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے اور پھر یہ نصب العین اس نظام تعلیم کو وجود میں لاتا ہو۔ چونکہ پوری قوم کا نصب العین ہوتا ہے اس لئے وہ طالب علم کو مدرسہ کی فضا سے باہر بھی گھر۔ بازار اور سماج کے ذریعہ سے متاثر کرتا رہتا ہے، اگر طالب علم اس نصب العین کے اثرات سے بچ جائے اور اس کے دل میں اس کی شدید محبت پیدا نہ ہو جائے تو اس کا مطلب سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوگا۔ کہ جب تک وہ مدرسے کے اندر اور مدرسے سے باہر رہا ہے یعنی ہر آن اور ہر لمحہ اس کے حواس اور ذہنی قوے کلی طور پر بیکار رہے ہیں اور اس کے لئے دیکھنا سننا محسوس کرنا سوچنا اور سمجھنا ممکن نہیں ہوا اگر ان دھیمے اور خاموش لیکن لقینی۔ قوی اور ناقابل انسداد مخصوص نصب العین اثرات کے باوجود کوئی ماہر تعلیم یہ سمجھتا ہے کہ اس نے طالب علم کو ایک مخصوص نصب العین کی تعلیم

نہیں دی تو اس سے زیادہ بے خبری اور غلط فہمی اور کیا ہوگی۔

جب ایک مخصوص نصب العین کی تعلیم کے بغیر چارہ نہیں تو پھر ضروری ہے کہ ماہر تعلیم یہ دیکھے کہ جو مخصوص نصب العین طالب علم کی تعلیم و تربیت کی بنیاد بننے والا ہے وہ اچھا ہے یا برا اور اگر برا ہے تو طالب علم کو اسکے اثرات سے محفوظ کرنے کا انتظام کرے۔ لیکن وہ ایک برے اور ناقص نصب العین کے اثرات کو اسوقت تک روک نہیں سکتا جب تک کہ وہ ایک اچھے نصب العین کے اثرات کو ان کی بجائے معرض عمل میں نہ لائے۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اسکے لئے ضروری ہوگا کہ وہ ایک سوچا سمجھا ہوا مخصوص نصب العین اس کے سامنے رکھے۔ تعلیم ایک مثبت عمل ہے منفی عمل نہیں معلم کے لیے صحیح طرز عمل یہ ہے کہ وہ طالب علم کو کہے کہ "یہ کرو" یہ نہ کہے کہ "یہ نہ کرو" لہذا ضروری ہے کہ ہم فیصلہ کریں کہ ہمیں طالب علم کو کس مخصوص نصب العین کے ماتحت تربیت دینا چاہیئے۔

سر پرسی نن کا ایک عجیب خیال

سر پرسی نن کا یہ خیال بھی عجیب و غریب ہے۔ کہ وہ سمجھتا ہے کہ خواہ فرد زندگی یا تعلیم کا کوئی نصب العین اختیار کرے اسکی انفرادیت کی نشوونما ایک ہی جیسی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اوپر کی مثال میں ایک تعلیم یافتہ انگریز اور ایک تعلیم یافتہ روسی کی انفرادیت کی نشوونما ایک جیسی نہیں ہوئی، ورنہ اقدار حیات کے متعلق ان کے نقطہ نظر میں تضاد نہ ہوتا۔ لہذا اگر دونوں میں سے ایک کی انفرادیت کی نشوونما صحیح طور پر ہوئی ہے تو دوسرے کی صحیح طور پر نہیں ہوئی اگر مخالف اور متضاد سمتوں میں بھی انفرادیت کی نشوونما ایک ہی جیسی ہوتی ہے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ سر پرسی نن کے نزدیک انفرادیت کی نشوونما کے معنی کیا ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سر پرسی نن کا خیال یہ ہے کہ جس نصب العین کو بھی آزادانہ طور پر اختیار کر لیا جائے وہ صحیح ہوتا ہے، گویا آزادانہ اختیار سے ایک معجزہ عمل میں آتا ہے جس سے ایک غلط نصب العین خود بخود صحیح ہو جاتا ہے اگر اس نے کہا ہوتا کہ اگر ایک غلط

نصب العین اختیار کرلیا جائے گا. تو چونکہ اس کی خامیاں کچھ مدت کے بعد آشکار ہو جائینگی.
اس کا اختیار کرنے والا خود بخود مجبور ہو گا. کہ اسے ترک کرکے ایک اور نصب العین اختیار کرے
اور اس طرح سے آخر کار وہ صحیح نصب العین تک پہنچ جائے گا. لہذا کسی بیرونی مداخلت کی ضرورت
نہیں. تو بات سمجھ میں آسکتی تھی. لیکن وہ یہ نہیں کہتا بلکہ وہ اسباب کو خوب سمجھتا ہے کہ معلم
کے لئے ہرگز ممکن نہیں کہ اپنے شاگردوں کو تجربات کے رحم و کرم پر چھوڑ دے اور پھر توقع رکھے
کہ وہ اپنی راہنمائی خود بخود کرینگے. چنانچہ اخلاقیات کی تعلیم کے بارے میں اظہار رائے کرتے
ہوئے وہ کہتا ہے.

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ بچوں کے فطرتی رجحانات نیکی کی طرف ایک طبعی میلان رکھتے
ہیں. لیکن ان سے یہ توقع رکھنا غلط ہے، کہ وہ زندگی کے ان مشکل مسائل کو
جنہیں حل کرنے سے بعض مخلص ترین اشخاص اور دنیا کی لائق ترین قومیں عاجز
رہی ہیں، کسی بیرونی امداد کے بغیر خود بخود حل کر لینگے ضروری ہے کہ ایسی ہستیاں
جن کی فطرت کا بنیادی تقاضہ تخلیقی کوششوں کی توسیع ہے آخر کار نیکی کی
جستجو کریں اور جب تک اسے پا نہ لیں چین سے نہ بیٹھیں لیکن شعور انسانی کی
المناک تاریخ اور اپنے آپ پر نوع انسانی کے مظالم کی افسوسناک داستان ظاہر
کرتی ہے کہ یہ جستجو کس قدر غیر یقینی ہے اور کس کثرت کے ساتھ اس کا نتیجہ تباہی
ہوتا ہے،

لیکن اگر مصنف کا خیال یہی ہے کہ اخلاقیات کی تعلیم کے سلسلے میں طالب علم کو بیرونی
امداد کی ضرورت ہے تو پھر ہمیں بتایا جائے کہ یہ بیرونی امداد کس قسم کے اخلاق کی طرف راہنمائی
کرے گی. ہر شخص کا فرض کا مفہوم الگ ہے. نیکی ایک اضافی چیز ہے اور اس کے مفہوم کا دارو
مدار زندگی اس نصب العین پر ہوتا ہے جس سے وہ اخذ کیا جائے. ہر نصب العین کی نیکی الگ ہوتی
ہے تو پھر ہم طالب علم کو کونسی نیکی کی تعلیم دیں. اگر ہم اس بات کا فیصلہ معلم پر چھوڑ دیں

تو کیا ہم یقین کر سکتے ہیں کہ معلم کا نصب العین اور اس سے پیدا ہونے والا نیکی کا تصور ہر حالت میں صحیح ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ ہر معلم کا نصب العین حیات اور نیکی کا تصور الگ ہو۔ جب سر پرسی نن مجبور ہو کر طالب علم کی بیرونی راہنمائی کے لئے نیکی کا کوئی معیار یا مفہوم مقرر کرینگے۔ تو وہ طالب علم پہ ایک مخصوص نظریۂ حیات مسلط کرنے کا وہی انتظام کر دینگے جس سے وہ گھبرا رہے ہیں۔

غرض سر پرسی نن کا یہ خیال درست نہیں کہ نہ زندگی کا ہی کوئی مخصوص نصب العین ہونا چاہیے اور نہ تعلیم کا۔ کیونکہ ایک مخصوص نصب العین کی تعلیم سے گریز کسی حالت میں بھی ممکن نہیں۔ لہذا بجائے اس کے کہ اس مخصوص نصب العین کا انتخاب طالب علم کے غیر تربیت یافتہ اور ناقابل اعتماد رجحانات یا اتفاقات پر چھوڑ دیا جائے اور پھر کبھی وہ اچھا ہو اور کبھی برا یہ بہتر ہے کہ ماہر تعلیم خود پوری سوچ بچار سے اس کے لئے ایک خاص نصب العین منتخب کر دے تاکہ اسی نصب العین کا اثر سارے نظام تعلیم میں سرایت کرے اور وہی طالب علم کے ذہن پر مسلط ہو اور کوئی دوسرا نصب العین جسے وہ غلط یا ناکافی سمجھتا ہے اس کی جگہ نہ لے لے اگر ہم اپنے نظام تعلیم کو جان بوجھ کر کسی اچھے نصب العین پہ قائم نہیں کرینگے تو وہ خود بخود کسی برے نصب العین پر مبنی ہو جائیگا۔ ذمہ داری ہم پہ عائد ہوگی، یہ حقیقت اکثر نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ تعلیم کے بارہ میں غیر جانبدار رہنا ناممکن ہے ہم مجبور ہیں کہ ہم یا تعلیم کا اچھا راستہ اختیار کریں یا برا ان دونوں کے درمیان ایک تیسرا راستہ جو نہ اچھا ہو نہ برا ممکن نہیں۔

صحیح نصب العین حیات کی دریافت کے بغیر چارہ نہیں

دراصل سر پرسی نن اور اس جیسے دوسرے مغربی ماہرین تعلیم کو دقت یہ ہے۔ کہ وہ نہیں جانتے کہ مختلف نصب العینوں میں سے صحیح نصب العین کسے قرار دیا جائے۔ اور کیوں۔ ہر قوم کہیگی کہ ہمارا نصب العین صحیح ہے اور جبتک ہمارے اچھے اور برے نصب العینوں میں امتیاز کرنے کے لئے کوئی معقول علمی معیار نہ ہو ہم کسی کے دعوے کی تردید نہیں کر سکتے لہذا انہوں نے اس مشکل کا حل یہ

نکلا ہے۔ کہ ہر شخص کو اجازت نہ دی جائے کہ وہ جو نصب العین چاہے اختیار کرے لیکن اس نقطہ نظر سے جو بیہودہ نتائج پیدا ہوتے ہیں وہ اسے مہمل ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اگر سر ہربسی نن اور اس جیسے دوسرے لوگوں کو صحیح نصب العین حیات یا صحیح نصب العین تعلیم معلوم نہیں تو اس مشکل کا یہ حل کیونکر ہو سکتا ہے کہ ہر نصب العین کو صحیح سمجھ لیا جائے جبکہ یہ اظہر من الشمس ہے کہ ہر نصب العین نہ صحیح ہوتا ہے اور نہ صحیح ہو سکتا ہے،

اگر انسان اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ زندگی کا کوئی نہ کوئی نصب العین رکھے۔ تو ضروری ہے کہ ان مختلف نصب العینوں میں سے جو ممکن ہیں ایک نصب العین صحیح بھی ہو اور صحیح نصب العین صرف ایک ہی ہو۔ انسان صحیح نصب العین کو چاہتا ہے، غلط کو نہیں چاہتا۔ جونہی کہ اس کو معلوم ہو جائے کہ اس کا نصب العین غلط ہے یا اس میں کوئی نقص یا خامی ہے تو وہ اسے ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت نہیں کرتا اور اسے فوراً ترک کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی کہے کہ حضرت! سب نصب العین ایک جیسے ہیں۔ اسی سے چمٹے رہئیے تو وہ اس کو ماننے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا۔ گویا صحیح نصب العین انسان کی فطرت کی ایک شدید ضرورت ہے:۔

انسان کی کوئی شدید قدرتی ضرورت ایسی نہیں جس کی تکمیل کا انتظام کارخانہ قدرت میں موجود نہ ہو اور جستجو سے مہیا نہ ہو سکتا ہو۔ لہذا صحیح نصب العین نہ صرف ممکن ہے۔ بلکہ تلاش سے دریافت کیا جا سکتا ہے اور اس کا تلاش کرنا عقلی اعتبار سے نہ صرف جائز ہے بلکہ ہمارا اولین فرض ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر ہر فرد بشر کا اپنا نصب العین الگ ہو اور نصب العین اتنے ہی ہوں جتنے افراد ہیں تو پھر یا تو نصب العین ایک بے حقیقت اور بے معنی چیز ہو گی جو انسان کی عملی زندگی پر کوئی اثر پیدا نہیں کرتی اور یا دنیا میں ہر طرف بدامنی اور انتشار کا دور دورہ ہو گا کس طرح سے ممکن ہے کہ انفرادیت کی نشوونما مختلف اور متضاد سمتوں میں بھی ایک

ہی جیسی ہو۔ جب ہر انسان کی فطرت ایک ہی ہے تو پھر سب کے لئے ایک ہی نصب العین کیوں ممکن نہ ہو یہ صحیح ہے کہ جب ہم ساری نوع انسانی کے لئے ایک ہی صحیح نصب العین کا فیصلہ کرینگے تو چونکہ ہر انسان کی انفرادیت بے مثل اور بے نظیر ہے ہر انسان اس کی جستجو اور تکمیل اور تحقیق اپنے خاص ڈھنگ سے کرے گا اور اس کے دوران میں اپنے مخصوص میلانات و ممکنات کو کام میں لائے گا۔ لیکن اس کا مطلب یہ قطعاً نہیں ہوگا کہ ہر فرد بشر کا نصب العین الگ ہے سر یہ سی ان خود تسلیم کرتا ہے کہ تفصیلات کی بوقلمونی اور رنگارنگی ایک مجموعی اور بنیادی وحدت کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے اس بات کے باوجود کہ ایک درخت کے سیب سب ایک جیسے ہوتے ہیں ان کے رنگ، حجم، شکل اور ذائقہ میں معمولی اختلاف ہو سکتا ہے سو مختلف شاعروں میں سے ہر ایک جو سانیٹ (Sonnet) لکھیگا وہ اپنی مجموعی حیثیت میں بے چون و بے نظیر ہوگا لیکن اس کے باوجود یہ ہو سکتا ہے کہ ان سب کا موضوع ایک ہی ہو۔ مثلاً انگلستان کی محبت۔

انسانی علوم کی تحقیق کے رستہ میں حکمائے مغرب کی بڑی رکاوٹ

فلسفہ، تعلیم اور اس جیسے دوسرے انسانی اور اجتماعی علوم کی صحیح تحقیق کے رستہ میں جو چیز حکمائے مغرب کیلئے سب سے بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ وہ انسان کی مادی توجیہ کرتے ہیں۔ اور کوشش کے باوجود اس نقطۂ نظر سے نجات پانے کی کوئی راہ نہیں نظر آتی وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے اپنی علمی بحثوں میں کہیں خدا کا نام لے لیا تو علمی نقطہ نگاہ سے ہماری بحث گھٹیا ہو جائے گی اور معیار سے گر جائے گی ان کے علمی اور عقلی نظریات میں خدا کی کوئی جگہ نہیں بنتی۔ لیکن اگر خدا دنیا میں موجود ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ اس کے بغیر ہم اپنے کسی عقلی اور علمی نظریہ کو عقلی اور علمی لحاظ سے درست اور معیاری بنا سکیں۔

ڈاروِن (Darwin) کے نظریہ ارتقاء کے تتبع میں وہ سمجھتے ہیں کہ انسان مادہ سے

ترقی کر کے موجودہ حالت کو پہنچا ہے، یہ باور کرنے کے لئے ان کے پاس ڈارون کے
نظریہ کا علمی سہارا ہے جسے وہ غلط قرار دیں تو کس بنا پر اور چھوڑیں تو کہاں جائیں۔ لہٰذا
وہ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے مادہ تھا۔ پھر اس میں کائنات کی میکانیکی قوتوں کے عمل سے
تغیر پیدا ہوا تو حیوان وجود میں آیا جس کا امتیازی وصف اس کی جبلتی خواہشات ہیں۔
پھر حیوانی جبلتوں سے کسی نہ کسی طرح سے وہ ذہنی اوصاف یا قوی پیدا ہوئے جو انسان
سے خاص ہیں اور جو اس کے مخصوص افعال اعمال کا موجب ہیں۔ مثلاً ضمیر اور عقل و فکر۔
سیاست۔ مذہب۔ فلسفہ۔ قانون۔ اخلاق۔ ہنر وغیرہ وہ مانتے ہیں کہ انسان اپنے ذہنی
قوی اور اوصاف اور افعال کے لحاظ سے حیوان سے مختلف ہے لیکن ان کے نزدیک
ان اوصاف اور افعال کا سبب انسان کی جبلتوں میں تلاش کرنا چاہیئے جو حیوان اور انسان میں
مشترک ہیں اور جو انسان نے حیوان سے وراثۃً حاصل کی ہیں کیونکہ اگر وہ حیوانی جبلتوں
سے پیدا نہیں ہوئے تو پھر کہاں سے آئے ہیں۔
چنانچہ مغرب کا ماہر نفسیات جس سے مغرب کا ماہر تعلیم فطرت انسانی کے متعلق اپنے
نظریہ کے اکثر عناصر مستعار لینے پر مجبور ہے انسان کے ان مخصوص اعمال کو یا تو ساری جبلتوں
کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ مثلاً میکڈوگل (Mc Dougall) اور یا ان میں سے کسی ایک کا مثلاً
فرائڈ (FREUD) اور ایڈلر (Adler) کے نزدیک انسان کی شخصیت کا بیشتر
حصہ اس کا لاشعور ہے جس کے اندر جنسی محبت کا ایک زبردست جذبہ ہے جنسی محبت
ایک جبلتی خواہش ہے جو حیوان میں بھی موجود ہے۔ لیکن فرائڈ سمجھتا ہے کہ وہ انسان میں
پہنچ کر زیادہ قوی اور معنی خیز ہو جاتی ہے۔ اسکی وجہ کیا ہے کیا انسان کی نسل جسے قائم
رکھنے کے لئے قدرت نے اسے جنسی خواہشات دی ہیں اس کی ان خواہشات کی غیر
معمولی قوت اور معنی خیزی کے بغیر قائم نہ رہ سکتی تھی۔ فرائڈ اس کے متعلق خاموش ہے
تاہم وہ کہتا ہے کہ انسان کے شعور کے سارے مشتملات اس کے جنسی جذبہ لاشعور سے

آتے ہیں۔ چونکہ انسان سماج کے خوف سے اپنے شرمناک لاشعوری جذبۂ جنسیت کو پوری طرح سے مطمئن نہیں کر سکتا لہذا وہ اس کے کچھ حصہ کو مذہب۔ اخلاق۔ علم ہنر وغیرہ کی صورت میں تبدیل کر کے مطمئن کرتا ہے۔ بچپن میں لاشعوری جذبۂ جنسیت ماں یا باپ کی جنسی محبت کی صورت اختیار کرتا ہے جسے آبائی الجھاؤ (Oedipus) کہا جاتا ہے بعد میں جب یہ الجھاؤ کمزور ہو جاتا ہے تو زندگی کے نصب العین اسکی جگہ لے لیتے ہیں۔ گویا نصب العینوں کی بنیاد جنسیت (Sexuality) ہے۔

ایڈلر (Adler) لاشعوری جذبہ کو حب تفوق یا استیلاء قرار دیتا ہے جو ایک جبلتی خواہش کی حیثیت سے انسان اور حیوان دونوں میں موجود ہے انسان بچپن میں کمزور ہونے کی وجہ سے ایک احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے اور پھر ساری عمر اس احساس کا علاج کرنے کے لئے بڑی بڑی کوششیں کرتا ہے تاکہ اسے دوسروں پر تفوق اور استیلاء حاصل ہو جائے اس کوشش میں وہ زندگی کے بعض بڑے بڑے نصب العینوں کا اختراع کرتا ہے اور انکی محبت اور جستجو میں سرگرداں رہتا ہے۔

جو لوگ انسان کی حیوانیت کو اس کے اعلیٰ ترین نصب العینوں کا منبع اور ماخذ سمجھتے ہیں ان سے کیا توقع ہو سکتی ہے کہ وہ زندگی یا تعلیم کا کوئی نصب العین معین کرینگے یا اس کے انتخاب کیلئے کسی ذہنی کاوش سے کام لینا ضروری سمجھیں گے۔

انسان کی اصل خودی ہے	مغربی حکماء کے نزدیک انسان کے ارتقاء کی ترتیب اس طرح سے ہے پہلے مادہ پھر حیوان اور پھر انسان۔ وہ ٹھیک کہتے ہیں کہ انسان کا ارتقا ایک درخت کی طرح ہوا ہے جسکی نشو و نما کی انتہا پر پھول یا بیج پیدا ہو جاتا ہے

لیکن وہ غلطی سے درخت کی نشو و نما کو تنے سے شروع کرتے ہیں کہ پہلے تنہ تھا۔ بعد میں اس سے شاخیں اور پتے پیدا ہوئے اور ان شاخوں اور پتوں سے پھول اور پھول سے بیج۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ ان کو فقط درخت کا تنہ ہی نظر آتا ہے، چونکہ بیج جس سے درخت

پھوٹتا ہے نہ زمین ان کی نظروں سے اوجھل تھا۔ وہ نہیں سمجھتے کہ بیج جو درخت کی نشوو نما کا آخری نتیجہ ہے وہی اس کا ابتدا بھی ہے،

اسی طرح سے انسان کی خودی Human self-consciousness جو اس کے مخصوص قوای اور اوصاف اور افعال کا منبع اور ماخذ ہے اور جس کا ظہور انسان کے ارتقا کا آخری نتیجہ ہے وہی کائنات کی خودی کی صورت میں انسان کی اصل بھی ہے۔ وہ کائنات کے وجود میں آنے سے پہلے موجود تھی اس نے اپنے اوصاف کے اظہار کے لئے کائنات کے درخت کو ارتقائی منازل سے گزارا ہے، اس ارتقا کے آخری نتیجہ کے طور پر اس درخت میں ایک پھول کا ظہور ہوا ہے جسے ہم انسان کہتے ہیں اور جس میں خودی کائنات کے اوصاف کا عکس موجود ہے،

خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے !
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

انسان کی حقیقت اس کا مادی جسم یا اس کی حیوانی جبلتیں نہیں۔ نہ ساری جبلتیں اور نہ ان میں سے کوئی ایک جبلت۔ بلکہ اسکا شعور یا اس کی خودی ہے جسم خودی سے پیدا ہوا ہے۔ خودی جسم سے نہیں ہوئی،

قالب از ما ہست شد نے ما ازو۔ (رومی)

خودی کائنات نے انسانی جسم کو اپنے اوصاف کے نمودار کرنے کے لئے ایک ذریعہ کے طور پر پیدا کیا ہے، حیوانی مرحلہ ارتقا میں جبلتوں کا پیدا کرنا اس لئے ضروری تھا کہ جسم حیوانی جسے انسان کہتے ہیں اور جو اپنے دماغ کی مکمل ساخت کی وجہ سے خودی کے ظہور کا ذریعہ بن سکتا تھا وجود میں آجائے۔ ہم جسے انسان سمجھتے ہیں وہ انسان کی خودی ہے اند ہڈیوں اور پٹھوں اور گوشت اور پوست کا وہ ڈھانچہ نہیں۔ جو اس کا خادم ہے۔

اے برادر تو ہمیں اندیشۂ
مابقی تو استخوان و ریشۂ

اسی انسان کی تعلیم و تربیت ہمارے ماہرین تعلیم کے ذمہ ہے۔ انسان کی اعلیٰ ترین سرگرمیاں جو اس کی خصوصیت ہیں مثلاً ضمیر، عقل و فکر، محبت تصورات و نظریات۔ مذہب، فلسفہ، اخلاق، سیاست، علم اور ہنر انسان کی خودی کی سرگرمیاں ہیں اور انسان کی جسمانی یا حیوانی جبلتیں خودی کی خدمت گزار اور حاشیہ بردار ہیں۔ چونکہ انسان کی تعلیم اور تربیت سے مراد اس کی خودی کی تعلیم و تربیت ہے ضروری ہے کہ تعلیم اور تربیت کی تمام صورتیں اس غرض و غایت کے ماتحت ہیں۔

حقیقت انسان کے متعلق یہ نقطۂ نظر اختیار کرنے سے ماہرین تعلیم اور دوسرے انسانی اور اجتماعی علوم کے محققین کی ساری مشکلات کا حل پیدا ہو جاتا ہے اس صدی کے علم الحیات اور علم الطبیعات کے انکشافات سے اس نقطۂ نظر کی حمایت ہوتی ہے کیونکہ وہ اس نتیجہ کی طرف راہ نمائی کرتے ہیں کہ کائنات کی حقیقت مادہ نہیں بلکہ شعور (Consciousness) یا خودی ہے۔ ڈارون کا نظریہ جس نے مغرب کے تمام انسانی اور اجتماعی علوم کو متاثر کیا ہے۔ انیسویں صدی کی پیداوار تھا جب سائنسدان مادہ کو حقیقی سمجھتے تھے لیکن اس بیسویں صدی کی تحقیقات نے سائنسدانوں کو اس نظریہ کے ترک کرنے پر مجبور کیا ہے جس سے حقیقت انسان کے متعلق خالص اسلامی نقطۂ نظر کے لئے راستہ صاف ہو گیا ہے۔ تاہم یورپ کے انسانی اور اجتماعی علوم پر ڈارون کے نظریہ کا اثر اب تک باقی چلا آتا ہے۔ مغرب کے ان خارج از وقت علوم سے اقتباس کر کے اپنی ہدایت چاہنا وقت کے پہیے کو پیچھے کی طرف دھکیلنے کے مترادف ہے اب ہمیں چاہیئے کہ ہم نئے انسانی اور اجتماعی علوم کی داغ بیل ڈالیں جو حقیقت مادہ پر نہیں۔ بلکہ حقیقت خودی پر مبنی ہوں۔

اب سوال یہ رہجاتا ہے۔ کہ خودی کی تربیت جو تعلیم کا مقصد ہے کس طرح ہوتی

خودی کی تربیت کے قوانین

ہے درحقیقت جس طرح سے جسم کی تربیت کا سامان قدرت نے جسم کے فطرتی حیاتیاتی رجحانات کے اندر رکھ دیا ہے اور جب ہم جسم کی تربیت کرنا چاہیں تو ہم اس کے سوائے اور کچھ نہیں کر سکتے۔ کہ ان رجحانات سے کام لیں ان کی تائید اور اعانت کریں اور ان کے راستہ کی رکاوٹوں کو دور کر دیں اور ایسا کرتے ہوئے ان کے اعمال میں کم از کم مداخلت کریں تاکہ ان کی مزاحمت کے موقع پیدا نہ ہوں۔ اسی طرح سے قدرت نے خودی کی تربیت کا سامان خودی کے فطرتی نفسیاتی رجحانات میں رکھ دیا ہے اور جب ہم خودی کی تربیت کرنا چاہیں تو ہمیں اس کے سوائے اور کچھ نہیں کرنا چاہیئے کہ ہم ان نفسیاتی رجحانات سے کام لیں۔ ان کی تائید اور اعانت کریں۔ ان کے راستہ کی رکاوٹوں کو دور کریں اور ایسا کرتے ہوئے خود ان کے عمل میں کم از کم مداخلت کریں تاکہ ان کی مزاحمت کے مواقع پیدا نہ ہوں۔

اگر جسم کے فطرتی حیاتیاتی رجحانات کو مطمئن کیا جائے تو اس کا آخری نتیجہ جسمانی صحت اور طاقت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اگر خودی کے فطرتی نفسیاتی رجحانات کو مطمئن کیا جائے تو اس کا نتیجہ خودی کی صحت اور طاقت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ خودی کی صحت یہ ہے کہ اسے اطمینان اور راحت اور خوشی حاصل ہو۔ یہی نفسیاتی یا ذہنی صحت (Psychological or Mental health) ہے اور خودی کی طاقت یہ ہے کہ وہ اپنے ارادوں کو حیوانی یا جبلتی خواہشات کی ممکن مزاحمت کے باوجود عملی جامہ پہنا سکے۔ یہی قوت ارادی (WILL-POWER) ہے۔

جس طرح سے بیماری جسم کی صحت کو برباد کرتی ہے اسی طرح بدی خودی کے اطمینان کو برباد کرتی ہے جسم جب طاقتور ہوتا ہے تو بیماری پر فتح پاتا ہے اور بیماری اس میں جڑ نہیں پکڑ سکتی۔ خودی جب طاقتور ہوتی ہے۔ تو وہ بدی پر فتح پاتی ہے اور بدی اس

میں جڑ نہیں پکڑ سکتی۔

جسم کا فطرتی حیاتیاتی رجحان یہ ہے کہ وہ کھانے کے لئے اعلیٰ درجہ کی صحت اور قوت بخشنے والی غذا چاہتا ہے۔ یعنی ایسی غذا جس میں وہ تمام حیاتین (Vitamins) موجود ہوں جو جسم کی پرورش میں حصہ لیتے ہیں۔ صرف اس قسم کی غذا جسم کی ضرورت کو پورا کر سکتی ہے جسم اسے ہضم کر کے اپنا جزو بناتا ہے اور اس سے صحت اور قوت حاصل کرتا ہے خودی کا فطرتی نفسیاتی رجحان یہ ہے کہ وہ محبت کرنے کے لئے ایک اعلیٰ درجہ کا تصورِ حسن چاہتی ہے جس کی محبت سے اسے اطمینانِ قلب حاصل ہو یعنی ایسا تصورِ حسن جس میں حسن کے وہ تمام اوصاف (Attributes of beauty) موجود ہوں جنکی تمنا خودی کی فطرت کے اندر رکھی گئی ہے ایسا تصورِ حسن ہی خودی کی ضرورت کو پورا کر سکتا ہے۔

خودی کی صحت اور قوت کیلئے اوصافِ حسن کی حیثیت وہی ہے جو جسم کی صحت اور طاقت کے لئے غذا کے حیاتین کی ہے جس طرح سے ضروری حیاتین کے بغیر جسم مرجاتا ہے اسی طرح سے ضروری اوصافِ حسن کے بغیر خودی مایوس اور پژمردہ ہو جاتی ہے۔

جس طرح سے ہر غذا جسم کی صحت اور قوت کی ضامن نہیں ہو سکتی۔ بلکہ وہی ہو سکتی ہے جو جسم کے فطرتی حیاتیاتی رجحانات کو پوری طرح سے بروئے کار لائے اور اپنے مکمل غذائی عناصر یا مکمل حیاتین کی وجہ سے جسم کی تمام حیاتیاتی ضروریات کو پورا کر سکے۔ اسی طرح سے ہر تصورِ حسن خودی کی صحت اور طاقت کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہی ہو سکتا ہے جو خودی کے فطرتی نفسیاتی عناصر یعنی مکمل اوصافِ حسن کے سبب سے خودی کی تمام نفسیاتی ضروریات کو پورا کر سکے انسانی خودی کے تقاضائے حسن کو بدرجۂ کمال پورا کرنے والا یہ مکمل تصورِ حسن اس کا نا قی

خدا کا تصور خودی کی تربیت کا سرچشمہ ہے

خودی کا تصور ہے جو اسکی تخلیق کا سرچشمہ ہے۔ اور جسے ہم خدا کہتے ہیں

جس طرح جسم کی شدید حیاتیاتی ضرورت کی چیز یعنے غذا کو مہیا کرنے کے لئے قدرت نے اپنا انتظام کیا ہے یعنی زمین سے غلہ اور غذا کی دوسری چیزیں پیدا کرنے کے لئے ہوا پانی اور روشنی کو بہم پہنچایا ہے اسی طرح سے خودی کی شدید نفسیاتی ضرورت کی چیز یعنے مکمل تصور حسن کی تعلیم کے لئے قدرت نے اپنا انتظام کیا ہے جسے نبوت کہتے ہیں اور جس کی مکمل صورت خاتم النبیین حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی نبوت ہے جن پر قرآن نازل ہوا ہے قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ مکمل تصور حسن جو خودی کی تمام فطرتی نفسیاتی ضروریات کو بدرجۂ کمال پورا کر سکتا ہے اور جو اس کی صحت اور طاقت یعنی اس کی خوشی اور قوت ارادی کی تکمیل کا ضامن ہے خوبیٔ کائنات یا خدا کا تصور ہے۔

فطرۃ اللہ الّتی فطر الناس علیھا

دین اسلام انسان کی وہی فطرت ہے جس پر خدا نے انسان کو پیدا کیا۔ کیونکہ اس میں وہ تمام اوصاف حسن بدرجۂ کمال موجود ہیں جو خودی کی محبت کو مطمئن کر سکتے ہیں۔

لہُ الاسمآء الحُسنیٰ

تمام اوصاف حسن کا مالک اللہ ہی ہے۔

کسی غذا کی صحت اور طاقت بخشنے والی خاصیات کو ثابت کرنے کے لئے کیمیاوی تجزیہ بھی کام دے سکتا ہے۔ لیکن ان کا کوئی ثبوت اس سے بہتر نہیں۔ کہ غذا کو استعمال کر کے تجربہ کر لیا جائے۔ اسی طرح سے اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے کہ خدا کے تصور میں وہ تمام اوصاف بدرجۂ کمال موجود ہیں جنکی محبت سے خودی صحت اور طاقت حاصل کرتی ہے۔ ہم عقلی تجزیہ اور استدلال سے بھی کام لے سکتے ہیں۔ لیکن اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کوئی نہیں کہ خودی کو اس تصور کی محبت کا خوگر بنا کر دیکھ لیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خودی کو ایسا نور عمل اور اطمینان قلب حاصل ہوگا۔ جو اور کسی تصور سے ممکن نہیں۔

الا بذکر اللہ تطمئن القلوب

یاد رکھو کہ اللہ کی محبت سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

خدا کا تصور وہ مکمل تصور حسن ہے جو انسان کی زندگی کا صحیح نصب العین اور تعلیم کا

صحیح نصب العین حیات اور صحیح مقصدِ تعلیم

بھی صحیح نصب العین ہے اسی تصور کی محبت ہے جس سے انسان کی سیرت کی تعمیر ہوتی ہے جو انسان کو ایک مکمل زندگی کے لئے تیار کرتی ہے جو ایک تندرست جسم کے اندر ایک تندرست جان پیدا کرتی ہے۔ جو انسان کی بہترین مخفی صلاحیتوں کو پیدا کرتی ہے اور جو انسانی انفرادیت کی اس آزادانہ نشو و نما کو ممکن بناتی ہے جو سر پرسی نن کے نزدیک تعلیم کا مدعا ہونا چاہیئے۔ اپنی زندگی میں کامیاب ترین انسان اور نیز اعلیٰ ترین تعلیم اور تربیت یافتہ انسان وہ ہے جس نے اس تصور کی محبت کو درجۂ کمال تک پہنچایا ہو اور جو اس محبت کو اپنی عملی زندگی میں ٹھیک طرح سے اور پوری طرح سے ظاہر کر رہا ہو۔ ماہر تعلیم کا فرض ہونا چاہیئے، کہ وہ اس بات کا اہتمام کرے کہ اس تصور کی محبت اور اس کے اوصاف کی محبت نہ صرف طالب علم کے دل میں پوری طرح سے نشو و نما پائے بلکہ اس کی عملی زندگی کے ہر پہلو میں بھی پوری طرح سے نمودار ہو۔

حسن خودی کی غذا ہے اور حسن کی محبت خودی کی بھوک ہے، خودی اپنی

فطرت انسانی کے اہم قوانین

جس کی تسکین پر اس کی تربیت اور نشو و نما کا دار و مدار ہے اپنی فطرت کے بعض قوانین کے ماتحت مطمئن کرتی ہے، ضروری ہے کہ ماہر تعلیم جو خودی کی تربیت کا ذمہ دار ہے ان قوانین سے واقف ہو۔ لہٰذا ان کو ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

(۱) اگر کسی شخص کو اچھی غذا نہ مل سکے تو پھر بھی وہ اپنی بھوک کو روک نہیں سکتا۔ بلکہ مجبور ہوتا ہے کہ اسے جو غذا بھی مل جائے اسی سے اپنی بھوک کی تسکین کا سامان

پیدا کرے اور اسی میں لذت محسوس کرے اسی طرح جب خودی اپنی لاعلمی کی وجہ سے مکمل تصور حسن کو جو اس کے لئے صحیح اور مکمل غذا کا حکم رکھتا ہے نہیں پا سکتی یعنی اس کے محاسن اور کمالات کا ذاتی احساس کرنے سے قاصر رہ جاتی ہے تو وہ مجبوراً ایک غلط اور غیر مکمل تصور کو اپنی محبت کے لئے اختیار کر لیتی ہے۔ اس تصور میں اسے چند اوصاف حسن کی جھلک تو صاف طور پر نظر آتی ہے۔ لیکن باقی ماندہ صفات حسن کو وہ اسکی طرف شعوری یا غیر شعوری طور پر لیکن ہر حالت میں غلط طور پر منسوب کر کے ان کی موجودگی کا احساس کرنے لگتی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ کسی غلط تصور سے بھی اس وقت تک محبت نہیں کر سکتی۔ جب تک کہ وہ اس کی طرف ان تمام صفات حسن کو منسوب نہ کرے جو صرف مکمل تصور حسن میں موجود ہیں اور جن کی تمنا اسکی فطرت کے اندر ودیعت کی گئی ہے ایسا کرنے کے بعد وہ اپنے غلط اور غیر مکمل تصور حسن سے بھی اس طرح محبت کرتی ہے گویا کہ وہ سچ مچ کا صحیح اور مکمل تصور حسن ہے،

(۲) تصور حسن کی محبت کا تقاضا تصور حسن کی ستائش اور پرستش ہے۔ تصور کی ستائش اور پرستش سے خودی مطمئن ہوتی ہے اور تربیت پاتی ہے،

(۳) تصور حسن خواہ صحیح ہو یا غلط خودی کی ساری زندگی کا نصب العین اور مدار اور محور بن جاتا ہے خودی کے سارے جذبات و احساسات اور اعمال و افعال اس نصب العین کے ماتحت پیدا ہوتے ہیں۔ وہ اس کے لئے اپنی ساری زندگی وقف کرتی ہے۔ اسی کے لئے زندہ رہتی اور مرتی ہے۔ خودی کو معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسے اپنے نصب العین کو حاصل کرنے کے لئے کون سے اعمال کو اختیار کرنے اور کون سے اعمال کو اختیار کرنے اور کون سے اعمال کو ترک کرنے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا وہ اپنے نصب العین سے ایک قانون اخلاق یا ضابطہ عمل اخذ کرتی ہے اور نصب العین کی محبت کی خاطر اس پر سختی سے کاربند رہتی ہے۔ اگر اس کا تصور حسن یا نصب العین صحیح ہو تو یہ قانون

اخلاق یا ضابطہ اور امر و نواہی بھی صحیح ہوتا ہے۔ ورنہ غلط ہوتا ہے۔

(۴) ایک تصور حسن یا نصب العین حیات کو ماننے والے افراد اپنے نصب العین کی محبت سے مجبور ہوتے ہیں کہ وہ مل کر ایک جماعت بنائیں اور اس جماعت میں رہیں۔ نصب العین کی محبت اس جماعت کے افراد میں وحدت اور تنظیم پیدا کرتی ہے اور لہٰذا جماعت ایک ریاست کی شکل اختیار کر لیتی ہے ریاست کی تمام سیاسی۔ فوجی۔ اقتصادی۔ قانونی تعلیمی سماجی اور علمی سرگرمیاں اس نصب العین کے ماتحت پیدا ہوتی ہیں اور قدرتی طور پر (جیسا کہ فرد کی صورت میں درست ہے) اگر ریاست یا جماعت کا نصب العین صحیح ہو تو اس کی یہ سرگرمیاں بھی صحیح ہوتی ہیں ورنہ غلط ہوتی ہیں۔

ریاست کے افراد اپنے نصب العین کے نفسیاتی اثرات آئندہ نسلوں کو ورثتاً سپرد کرتے ہیں اور اس طرح سے نصب العین صدیوں تک زندہ رہتا ہے۔ اشتراکیت، جمہوریت انگریزی قومیت۔ ہندی قومیت امریکی قومیت ایسے ہی نصب العین ہیں جو سب غلط ہیں

(۵) جب ایک نصب العین غلط ہو تو چونکہ اس میں تمام اوصاف حسن فی الواقعہ موجود نہیں ہوتے۔ بلکہ چند اوصاف حسن کے نمائشی وجود کی بنا پر فرض کر لئے جاتے ہیں اس لئے کچھ مدت کے بعد خودی کو اس کے نقائص کا علم ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی محبت کمزور ہو جاتی ہے اور بالآخر مٹ جاتی ہے، جب یہ صورت پیش آتی ہے تو خودی اپنے تقاضائے حسن کو مطمئن کرنے کے لئے ایک اور تصور کو اختیار کر لیتی ہے اس طرح سے ہر غلط تصور آخر کار ناتسلی بخش اور ناپائیدار ثابت ہوتا ہے۔

خودی کی محبت صفات کے نتائج اور ان کی تعلیمی اہمیت

(۶) خودی کی فطرتی محبت نہ صرف خدا سے ہے۔ بلکہ خدا کی صفات حسن سے بھی ہے۔ یعنی ان صفات کے لئے اس کی فطرت میں ایک علیحدہ کشش ہے جو ہر شخص میں موجود ہوتی ہے خواہ اس کا تصور حسن صحیح ہو یا غلط اور وہ مومن ہو یا کافر۔ لیکن یہ کشش صفاتِ حق نصب العین کی محبت کے

ماتحت ظہور پاتی ہے اس سے الگ یا اس کی مخالفت میں ظہور نہیں پاسکتی۔

محبت صفات کا ایک نتیجہ عالمگیر اصول اخلاق کی محبت میں ظاہر ہوتا ہے جب کوئی شخص صفات حسن کے مطابق عمل کرتا ہے تو اس کا عمل سچائی۔ انصاف۔ نیکی وغیرہ عالمگیر اصول اخلاق کے مطابق سمجھا جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کے دل میں خواہ وہ کافر ہو یا مومن عالمگیر اصول اخلاق کی پابندی کا فطرتی جذبہ موجود ہے لیکن چونکہ کافر کا نصب العین حیات غلط ہوتا ہے اور وہ نصب العین اس کیلئے اوامر اور نواہی کا ایک الگ ضابطہ مقرر کرچکا ہوتا ہے۔ لہذا کافر کے لئے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ عالمگیر اصول اخلاق یا صحیح تصور حسن کے ضابطہ اوامر و نواہی کی پابندی کرسکے۔ ان اصولوں کے لئے اسکی فطرتی کشش اسکے غلط نصب العین اور اس کے مقرر کئے ہوئے قانون عمل کی محبت سے مغلوب ہوکر رہجاتی ہے اس کے برعکس مومن کے لئے جس حد تک کہ وہ فی الواقعہ صحیح تصور حسن کی محبت رکھتا ہو۔ ان عالمگیر اصول اخلاق کے مطابق عمل کرنا آسان ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا نصب العین یا تصور حسن صحیح ہوتا ہے اور اسکی محبت ان اصولوں کی فطرتی کشش کے ساتھ مزاحمت نہیں کرتی۔ بلکہ ان کی اور تائید کرتی ہے۔ کیونکہ یہ اصول اسی صحیح نصب العین کے ضابطہ اوامر و نواہی پر مشتمل ہوتے ہیں۔

محبت صفات کا دوسرا نتیجہ علم کی جستجو میں ظاہر ہوتا ہے کیونکہ علم کی تلاش سچائی۔ صداقت یا حق کی جستجو ہے۔ حق خدا کی ایک صفت ہے اور علوم خدا کی اس صفت کے جزوی انکشاف کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ انکشاف ایک قوت ہے جس کی مدد سے انسان اپنے نصب العین کی خدمت اور اعانت بہتر طریق سے کرسکتا ہے۔

اس کا تیسرا نتیجہ ہنر Art کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جب ہم کسی ظاہری واسطہ کے ذریعہ سے حسن کا اظہار کرتے ہیں تو اسے ہنر Art کہا جاتا ہے۔ مثلاً

جب ہم لفظ میں حسن کا اظہار کرتے ہیں تو اسے شعر کہا جاتا ہے۔ جب سنگ و خشت میں حسن کا اظہار کرتے ہیں تو اسے بت سازی اور تعمیر کا نام دیا جاتا ہے وعلیٰ ہٰذا القیاس خودی کائنات اپنی تخلیق میں حسن کا اظہار کرتی ہے۔ کیونکہ اس کی تخلیق کا سر چشمہ ہی حسن کی محبت ہے۔ لہٰذا اس کی تخلیق ہنر کی صورت اختیار کرتی ہے وہ مصور ہے نقاش ہے، اور اس کی ہر تخلیق میں ترتیب۔ تنظیم اور بناوٹ کے اوصاف موجود ہوتے ہیں۔ انسانی خودی میں بھی اپنی ہر تخلیق میں حسن کا اظہار کرنے کی خواہش موجود ہے اور اس اظہار حسن سے اس کی محبت نشو و نما پاتی ہے گویا ہنر خودی کی تربیت کا ایک ذریعہ ہے لیکن یہ اسی صورت میں کار آمد ہے جب اسے صحیح نصب العین کی محبت اور خدمت کے ماتحت کام میں لایا جائے ہنر کی کئی قسمیں ایسی ہیں جو آسانی سے بد اخلاقی کا ذریعہ بنجاتی ہیں۔ مثلاً موسیقی اور ناچ ان سے طالب علم کو فائدہ کی بجائے نقصان کا اندیشہ ہے لیکن ہنر کی ایک قسم ایسی ہے جو تعلیمی نقطۂ نظر سے بے حد اہم ہے اور جس کی طرف معلم کو لازماً توجہ دینی چاہئیے اور وہ ہے طرز زندگی میں حسن کا اظہار۔ جو شخص اپنے گھر کی تزئین و آرائش میں کمروں کے اندر چیزوں کی ترتیب میں اپنی وضع قطع میں اپنے لباس میں اپنی نشست و برخاست اور بات چیت میں۔ لوگوں کے ساتھ اپنے میل جول اور برتاؤ کے طریقوں میں اور چلتے پھرتے۔ سفر کرتے۔ کھیلتے۔ لکھتے پڑھتے اپنی جملہ حرکات و سکنات میں حسن کا اظہار کرنا جانتا ہے۔ وہ یقیناً دوسرے لوگوں سے زیادہ تربیت یافتہ ہے۔

ہنر کی اہمیت

فطرت انسانی کے ان حقائق سے ماہر تعلیم نہایت ہی اہم نتائج اخذ کر سکتا ہے۔ مثلاً اسے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے لئے ضروری ہے کہ طالب علم کے سامنے خودی کائنات کے تصور کو زندگی اور تعلیم کے ایک مثبت

صحیح نظام تعلیم

نصب العین کے طور پر کیے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو طالب علم کے دل و دماغ پر غلط
اور ناقص نصب العین مسلط ہو جائیگا۔ اور پھر نتیجہ یہ ہوگا کہ طالب علم کی ساری زندگی غلط
راستہ پر چل نکلیگی جیسے کہ وہ ٹرین جس کا کانٹا غلط طور پر بدل دیا گیا ہو۔ وہ فرض نیکی
سچائی، آزادی، انصاف اور اس جیسی دوسری اقدار کا مفہوم غلط سمجھیگا اور وہ مفہوم وہی
ہوگا جو اس کا غلط نصب العین تلقین کرے گا۔ پھر ان حقائق سے ماہر تعلیم کو معلوم ہو جاتا ہے،
کہ اس تصور کی بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلیم کے بغیر وہ اسباب کی توقع نہیں کر سکتا۔ کہ طالب علم
میں عالمگیر اصول اخلاق کے مطابق عمل کرنے کا ملکہ پیدا ہوگا۔

ہم میں سے بعض کا خیال ہے کہ اسلامی نظریۂ زندگی کے مطابق تعلیم دینے کے
معنی یہ ہیں کہ اخوت۔ مساوات اور رواداری ایسی اسلامی اقدار کو نظام تعلیم میں داخل
کر دیا جائے بیشک اگر اخوت۔ مساوات۔ اور رواداری کے اقدار کو اسلامی نقطہ
نظر سے سمجھا جائے تو وہ اسلامی اقدار ہیں۔ لیکن جب تک نظام تعلیم کے اندر خدا کے
تصور کو علی الاعلان داخل نہ کیا جائے اور طالب علم کے دل میں اس تصور کی محبت کو
درجۂ کمال پر نہ پہنچایا جائے اس وقت تک ناممکن ہے کہ طالب علم ان اقدار پر عمل کرنا
تو ایک طرف ان کی روح سے بھی آشنا ہو سکے۔

پھر ایک ماہر تعلیم کو ان حقائق سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ طالب علم کی تربیت اس وقت
تک ناقص رہیگی جب تک کہ وہ اسے خودی کے تقاضائے حسن کو ہر اس طریق سے مطمئن
کرنے کے مواقع بہم نہ پہنچائیگا جو خودی کے فطرتی نفسیاتی رجحانات کے اندر مقرر ہو چکا
ہے مثلاً یہ کہ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ تصور حسن کی ستائش اور پرستش کے مواقع بہم پہنچانے
تصور حسن کی ضروریات کے ماتحت اور اسکی بہتر خدمت اور اعانت کیلئے طالب علم کو ضروری
حد تک ضروری علوم سے آشنا کرائے۔ طالب علم کے اخلاق کی تربیت اس طرح سے کرے
کہ اس میں صفات باری تعالےٰ کا عکس نمودار ہو اور اسے طرز بود و باش میں حسن و جمال

کے اظہار کی راہنمائی کرے اور پھر ان حقائق سے ماہر تعلیم کو یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ مغرب کے جملہ نظام ہائے تعلیم جن میں سے ایک اس ملک میں رائج ہے سب کے سب غلط ہیں۔ کیونکہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو صحیح نصب العین پر مبنی ہو۔ زندگی کے غلط نصب العین جہاں جہاں موجود ہیں، غلط تعلیم کا نتیجہ ہیں اور غلط تعلیم جہاں جہاں موجود ہے غلط نصب العین کی محبت پیدا کر رہی ہے۔ ہر نصب العین سے ایک مخصوص نظام تعلیم نکلتا ہے اور ہر نظام تعلیم ایک مخصوص نصب العین کی محبت پیدا کرتا ہے۔

فطرت انسانی کے ان حقائق کی بنا پر ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم موجودہ نظام تعلیم کو موقوف کر کے اسکی جگہ فی الفور ایک نیا نظام تعلیم نافذ کریں جو زندگی اور تعلیم کے صحیح نصب العین یعنے خودی کے نصب العین پر مبنی ہو۔ تعلیم کے معاملہ میں ایسے لوگوں کا تتبع کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی وجہ جواز نہیں جنہوں نے گو فن تعلیم اور فلسفۂ تعلیم کے متعلق بہت سا لٹریچر پیدا کیا ہے لیکن جو اس کے باوجود تعلیم کے صحیح مقصد اور مدعا سے بے خبر ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہی ہے۔ جیسے کوئی شخص ایک خاص سفر کیلئے مہینوں سے تیاریاں کر رہا ہو لیکن یہ نہ جانتا ہو کہ اس نے جانا کہاں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک ایسی ٹرین میں بیٹھ جائے جو اس کی منزل مقصود سے بالکل برعکس سمت میں جاتی ہو۔ جب تک تعلیم کا صحیح مقصد معلوم نہ ہو اس وقت تک اگر تعلیم کے موضوع پر ہزاروں کتابیں بھی لکھی جائیں تو بے کار ہیں۔

مغرب میں مذہب اور تعلیم کے افتراق کی وجہ

مغرب کے لوگوں نے اگر تعلیم کو مذہب سے الگ کر دیا ہے تو ان کے پاس اس کے سوائے اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ مذہب جب مغرب کی کسی قوم کے نصب العین حیات کا جزو نہیں تو کس طرح سے ممکن تھا کہ وہ ان کے نظام تعلیم کا جزو ہوتا۔ مذہب کو سیاست سے الگ کرنے کے بعد مغربی قوموں کے لئے ممکن نہیں تھا۔ کہ وہ اسے زندگی کے کسی شعبہ میں اپنے ساتھ رکھتے۔

ان کے ہاں مذہب اور تعلیم کا افتراق مذہب اور سیاست کے افتراق کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور مذہب کو سیاست سے الگ کرنے پر وہ اس لئے مجبور ہوئے تھے، کہ ان کا مذہب عیسائیت ان منظم جماعتوں کی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر تھا۔ جنہیں ریاستیں کہا جاتا ہے انہوں نے مذہب کو سیاست سے اس وقت مجبوراً الگ کیا جب کلیسا اور ریاست کے طویل جھگڑوں نے یہ بات پوری طرح سے ثابت کر دی تھی کہ دونوں کا یکجا رکھنا بے سود بلکہ ناممکن ہے۔ بعض وقت یورپ میں کلیسا اور ریاست کے انفصال کو ہم مکیاولی (Machia Yelli) کے فلسفہ کی طرف منسوب کرتے ہیں جس نے حکمران کو اختیار دے دیا تھا۔ کہ اگر ریاست کے اندرونی اور بیرونی انتظام کے لئے ضروری ہو تو وہ ہر قسم کی مذہبی اور اخلاقی قیود کو توڑ کر جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن در اصل یورپ میں مکیاولی کے فلسفہ کا ظہور ایک ایسے وقت میں ہوا جب یورپ کی قومیں اسے قبول کرنے کے لئے پہلے ہی پوری طرح سے آمادہ ہو چکی تھیں۔

لیکن زندگی کا وہ تصور جو ہمیں اسلام نے دیا ہے عیسائیت کے تصور سے بہت مختلف ہے۔ اسلام زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے سیاست نہ صرف اس سے مطابقت رکھتی ہے۔ بلکہ وہ اس سے الگ نہیں ہو سکتی پھر ہمیں کیا مصیبت پڑی ہے کہ ہم تعلیم کے بارے میں وہی نقطہ نظر اختیار کریں جو مغربی قوموں کو عیسائیت کے نقائص کی وجہ سے اختیار کرنا پڑا ہے مغرب کے ماہرین تعلیم کے لئے مذہب اور تعلیم کو بہم رکھنا ایسا ہی مضحک ہے جیسا کہ ہمارے لئے مذہب اور تعلیم کو جدا رکھنا۔

اگر ہم رائج الوقت نظریات زندگی مثلاً اشتراکیت۔ جمہوریت۔ قومیت وغیرہ کا بغور مطالعہ کریں تو یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ ایک قوم کا نصب العین حیات اس کی زندگی کے تمام شعبوں پر حکومت کرتا ہے اس کا نظام قانون۔ نظام سیاست۔ نظام تعلیم۔ نظام معاشیات۔ غرضیکہ اسکی

ہر قوم کا سیاسی نظریہ اس کا معیّن بنا ہے

زندگی کے تمام اعمال اس کے ماتحت تشکیل پاتے ہیں وہ ان کی خدمت کے لئے وجود میں آتے ہیں اور ہر آن ان کی خدمت کے لئے وقف رہتے ہیں غرض ایک قوم کا نصب العین حیات ایک ایسے معبود کا مقام حاصل کرتا ہے جو فی الواقعہ اس کی محبت پرستش اور اطاعت کا مرکز ہوتا ہے۔ یورپ کی تمام نام نہاد عیسائی قومیں اس وقت عملی طور پر جس خدا کی عبادت کر رہی ہیں وہ عیسائیت کا خدا نہیں اگرچہ یورپ کے لوگ اپنی زبان سے کبھی کبھی اس خدا کا نام بھی لیتے ہیں لیکن در اصل اب ان کا یقین اس سے اٹھ گیا ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ ان کی عملی زندگی کے کسی حصہ پر اس کا تسلط باقی رہے لہذا انہوں نے اسے زندگی کے ہر شعبہ سے خارج کر دیا ہے اور اب ان کی زندگی کے کسی پہلو کے ساتھ اس کا کوئی تعلق باقی نہیں۔ لہذا اب عیسائیت کے خدا کی بجائے یورپ کی قوموں نے اور معبودوں کو اختیار کر لیا ہے اور وہ ان کے سیاسی نظریات ہیں۔ اس وقت یورپ کی ہر قوم کا سیاسی نظریہ یا معبود الگ ہے اب بائبل کے خدا کی حقیقت ان کے نزدیک اس سے زیادہ نہیں کہ وہ ان کے اصلی معبود یعنی سیاسی نظریہ کے خادم کی حیثیت سے رہے تاکہ جب ضرورت پڑے اور جس حد تک ممکن ہو وہ اس کا نام لے کر اپنے اصلی معبود کے راستہ کی مشکلات کو آسان کر لیں۔

نظریۂ تعلیم نظریۂ زندگی کے ماتحت وجود میں آتا ہے

ہر قوم اپنا فلسفۂ تعلیم یا نظریۂ تعلیم اس طرح سے بناتی ہے کہ وہ ان کے نظریۂ زندگی کی مناسب خدمت کر سکے اور ان کی عملی زندگی کے معبود کے تقاضوں کو پورا کر سکے یورپ کے نظریات تعلیم جو مختلف یورپی قومیتوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے وجود میں آئے ہیں ہمارے نظریۂ زندگی کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتے جس طرح ان کے نظریات زندگی غلط ہیں اسی طرح ان کے نظریات تعلیم بھی غلط ہیں خودی کے نظریۂ حیات بلند تر اور صحیح تر نظریۂ حیات انسان کے ذہن میں نہیں آ سکتا۔

کیونکہ حق تعالےٰ کی ذات تمام کمالات معنوی کا مجموعہ ہے اور اس کے حسن و کمال کی انتہا نہیں۔ لہذا جو نظریۂ تعلیم خودی کے تصور پر قائم کیا جائیگا وہ صحیح ترین ہوگا۔

پھر تمام غلط نظریات زندگی ناتسلی بخش ہونے کی وجہ سے ناپائدار ہیں اور تاریخ انسانی کے جلد گزر جانیوالے مراحل ہیں۔ ضروری ہے کہ ہر نظریۂ زندگی ایک نہ ایک دن کسی فوری سیاسی انقلاب کی وجہ سے یا ایک تدریجی انحطاط کی وجہ سے ختم ہو جائے۔ انسان ایسے تصورات زندگی سے جو اس کی خودی کی ضروریات کو پورا نہ کر سکتے ہوں۔ مکمل اور مستقل طور پر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ نفسیات انسانی کے ٹھوس حقایق سے ثابت ہوتا ہے کہ ارتقائے کائنات کی قوتیں جن کے عمل سے کائنات رفتہ رفتہ کامل سے کامل تر ہوتی جا رہی ہے۔ بالآخر ہر غلط نظریۂ زندگی کو مٹا دیگی اور صرف خودی کا نظریۂ حیات روئے زمین پر باقی رہجائیگا۔ قرآن میں یہ پیش گوئی موجود ہے اور علمی حقائق اس کی تائید کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری قوم اپنے صحیح اور کامل نظریۂ زندگی کی وجہ سے ارتقا کی انتہا پر ہے اور دوسری قومیں ارتقا کے راستے پر قدم بقدم ہمارے پیچھے چلی آتی ہیں اور آخر کار ہماری قیادت قبول کرنے پر مجبور ہونگی۔

کس قدر افسوس ہے کہ ہم اقوام عالم کی راہنمائی کے اس معزز مقام کو جس پر قدرت نے ہمیں فائز کیا ہے دوسروں کے سپرد کر دیں اور تعلیم اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں خود ان کی دستگیری کرنے کی بجائے یہ آس لگائے بیٹھے رہیں کہ وہ ہماری دستگیری کرینگے جو لوگ انسانی زندگی کے مقصد سے ناآشنا ہیں وہ تعلیم کے بارے میں ہماری راہنمائی کیونکر کر سکتے ہیں۔

صحیح نظریۂ زندگی ایک ہے لیکن غلط نظریات زندگی لاتعداد ہیں اور چونکہ وہ لاتعداد

صحیح نظریۂ تعلیم کی اہمیت
امن اور ترقی کا ذریعہ

ہیں وہ نوع انسانی کو ایسے ٹکڑوں میں بانٹ دیتے ہیں جن میں اخلاقی نقطۂ نظر سے اشتراک عمل ممکن نہیں ہوتا۔ چونکہ ہر گروہ

یا قوم کا ضابطۂ اخلاق اس کے نظریۂ زندگی سے پیدا ہوتا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ وہ ہر دوسری قوم کے ضابطۂ اخلاق سے الگ ہو۔ اس طرح غلط نظریات کی پرستش نوعِ بشر کیلئے بے اتفاقی۔ جنگ۔ خونریزی اور بالآخر مکمل تباہی اور بربادی کا موجب ہوتی ہے اس خطرناک صورتِ حال کا علاج فقط ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ نوعِ بشر ایک نصب العین حیات پر متفق ہو جائے۔ یہ نصب العین وہی ہو سکتا ہے جو صحیح اور کامل ہو یعنی اس قابل ہو کہ خودی کے تقاضوں کو بتمام و کمال پورا کر سکے تو میں کسی غلط نصب العین پر متفق نہیں ہو سکتیں اور اگر وہ متفق ہو جائیں تو ان کا اتفاق تادیر قائم نہیں رہ سکتا اسکی وجہ یہ ہے کہ غلط نصب العین انسان کی فطرت کو مکمل طور پر مطمئن نہیں کر سکتا صرف صحیح نصب العین حیات ہی انسان کے لئے دائمی امن اور اطمینان اور ترقی و فارغ البالی کا ضامن ہے اگر ہم اپنا نظامِ تعلیم اس نصب العین کے مطابق بنائیں گے تو ہم ایک ایسی قوم تیار کرینگے جو اقوامِ عالم کو امن اور ترقی کا راستہ دکھا سکیگی۔

تعلیم بذاتِ خود نہ اچھی چیز ہے نہ بری۔ بلکہ صرف نظریاتِ زندگی کی خادم ہے

تعلیم قلبِ ذہنیت کا ایک زبردست انجن ہے

اور تمام نظریات کی خدمت اور اعانت یکساں طور پر کرتی ہے، جب وہ صحیح نظریۂ زندگی کی اعانت کرتی ہے تو اچھے نتائج پیدا کرتی ہے اور اچھی سمجھی جاتی ہے اور جب وہ کسی غلط نظریۂ زندگی کی اعانت کرتی ہے تو برے نتائج پیدا کرتی ہے اور قبیح سمجھی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں وہ بیکار ہی نہیں بلکہ مضر اور خطرناک ہوتی ہے تعلیم اپنے اچھے یا برے نظریہ زندگی کی اعانت اس طرح سے کرتی ہے کہ وہ انسان کو اس کا معتقد بنا دیتی ہے اور اعتقاد کو اس قدر پختہ کر دیتی ہے کہ وہ ایک مجنونانہ محبت یا عشق تک پہنچ جاتا ہے اور انسان کی ساری شخصیت کو جذب کر لیتا ہے پھر اس نظریۂ زندگی کیلئے ہر قسم کی قربانیاں اور جانفشانیاں کرنا اس کے لئے آسان ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ان اشخاص کے لئے جو کسی ملک کے تعلیمی

ذرائع پر پورا تصرف رکھتے ہوں نہایت آسان ہے کہ وہ نیکوں کاروں کے ایک گروہ کو اس طرح سے بدل دیں کہ وہ دنیا کے بدترین جرائم کا ارتکاب کرنے میں کوئی شرم یا ندامت محسوس نہ کریں یا بدکرداروں کی ایک جماعت کو نیکی کی محبت سے اس طرح سرشار کر دیں کہ ان کے لئے بدی یا گناہ کا ارتکاب ناممکن ہو جائے سب کو معلوم ہے کہ جرمنی۔ اٹلی اور روس کے انقلابات کے ابتدائی مراحل میں ان ملکوں کے لوگ جدید انقلابی تصورات سے کسقدر متنفر تھے لیکن رفتہ رفتہ تعلیم کے جادو نے ان کی ذہنیتوں کو یہاں تک بدل دیا کہ گزشتہ جنگ عظیم سے پہلے وہ ان تصورات کے لئے عظیم الشان قربانیاں کرنے کے لیے دل و جان سے تیار ہو گئے۔

کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ غلط نظریات زندگی کے پرستار تو تعلیم کی زبردست کل کو اس لئے اپنے کام میں لائیں۔ کہ شر و فساد اور جنگ و جدال کی قوتوں کو زیادہ سے زیادہ فروغ حاصل ہوتا ہے اور ہم صحیح نظریۂ حیات کے ماننے والے ان کے شر انگیز نظام ہائے تعلیم کو ایک مخفی طفلانہ محبت اور ستائش کے جذبہ سے دیکھتے رہیں اور خود دنیا کو شر و فساد اور جنگ و جدال سے بچانے کے لئے اس زبردست کل کو حرکت میں نہ لائیں۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ اور لوگ تعلیم کے طاقتور انجن کی مدد سے دنیا کو تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اسی انجن کو ان کے خلاف موڑ دیں۔ تاکہ دنیا تباہی سے بچ جائے اور اس کی صورت یہ ہے کہ ہم اپنے نظام تعلیم کو اس طرح سے بدلیں کہ اس کی وجہ سے ہمارے دلوں میں صحیح نظریۂ زندگی کی معقولیت اور عظمت اور اس کی والہانہ محبت کا جذبہ پیدا ہو۔ جب تک ہم خود اپنے نظام تصورات کی معقولیت اور عظمت کے قائل نہ ہوں گے، ناممکن ہے کہ ہم اس کی طرف دوسروں کو کامیابی سے دعوت دے سکیں۔

اسلامی تصورات خودی کی فطرت کے حقائق ہیں جو خودی کے لئے کشش

تبلیغ کا طریق اور تعلیم

رکھتے ہیں اور خودی کی جستجوئے صداقت کا مدعا ہیں۔ لہذا اگر
ہم ان کو دنیا کے سامنے ٹھیک طرح سے پیش کرنے کا ڈھب سیکھ جائیں۔ تو
یقینی بات ہے کہ نوع انسانی انہیں فوراً قبول کرنے کے لئے تیار ہو جائیگی دنیا کو
اسلام کی طرف دعوت دینے اور اسلامی تصورات کی طرف دعوت دینے میں بڑا فرق ہے
اور اس زمانہ میں ہمارے لئے اس فرق کی بڑی اہمیت ہے اگر ہم دنیا کو اس زمانے
میں اس کے امن و اتحاد کی خاطر اسلام کی طرف دعوت دینا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے
کہ ہم اس غرض کے لئے پہلے زمین کو ہموار کریں اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہم پہلے دنیا
کو اسلام کا نام لینے کے بغیر اسلامی تصورات کی طرف اس طرح سے دعوت دیں۔ کہ
لوگ ان کی صحت اور معقولیت کا اعتراف کرنے لگ جائیں۔ غیروں کے سامنے اسلام کی
تبلیغ کرتے ہوئے ہمیں اسلام کا نام اس وقت لینا چاہیے جب ہم یہ سمجھنے لگیں کہ
اب ہماری تبلیغ سے ان کے اندر اسلامی تصورات کی محبت اس حد تک پیدا ہو گئی
ہے کہ وہ ان تصورات کے آسمانی ماخذ یعنے قرآن کو ماننے کے لئے تیار ہو جائیں گے
اب تک اسلام کی تبلیغ کا جو طریقہ ہم نے اختیار کر رکھا تھا۔ وہ یہ تھا کہ اسلام کو
ایک کل WHOLE کے طور پر پیش کیا جائے یہ طریقہ اس زمانہ میں نہایت کامیاب
تھا جب اسلام کی بڑی بڑی روحانی شخصیتیں مثلاً حضور کے صحابہؓ یا اولیاء اور صوفیائے
کرام اسے کام میں لانے کے لئے موجود تھے، اور جب لوگ نسبتاً سادہ لوح اور
حق پسند تھے اب لوگ مذہب سے بیزار ہیں اور اسے ہوش و خرد کا دشمن سمجھتے ہیں۔ اس
زمانہ کے عقلیت زدہ لوگوں کو اسلامی افکار و آرا سے متاثر کرنے کا طریقہ یہ ہے
کہ ہم انہیں تدریجاً معروف سے غیر معروف کی طرف لائیں ان ہی کے مسلمات سے
آغاز کر کے جدید قسم کی علمی تحقیق اور نئے ڈھب کے عقلی استدلال کی مدد سے پہلے اسلامی

تصورات کی طرف اور پھر ایک کل کے طور پر اسلام کی طرف دعوت دیں۔ اپنی قوم کو اسلام کی ایسی علمی اور عقلی تبلیغ کا اہل بنانے کے لئے ہمیں ایک اسلامی نظام تعلیم کی ضرورت ہے۔

اسلامی تصورات کی تبلیغ جو اسلامی تعلیم اور تربیت پر موقوف ہے ہمارے لئے فقط اس بنا پر ضروری نہیں کہ وہ دوسری قوموں کی فلاح و بہبود کا ذریعہ بنیگی یا اس سے دنیا میں امن و اتحاد قائم ہوگا یا وہ ہمارے لئے سعادت اخروی کا موجب ہو گی۔ گو اس میں شک نہیں کہ قوموں کی فلاح و بہبود اور دنیا کے امن و اتحاد کا دار و مدار ہماری تبلیغ پر ہے اور یہ تبلیغ ہمارے لئے سعادت اخروی کا موجب بھی ہو گی۔ لیکن اسلام اور اسلامی تصورات کی تبلیغ کا مسئلہ خود ہمارے لئے اس دنیا میں بھی زندگی اور موت کی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے بغیر بلکہ اس میں ڈھیل اور سستی کرنے سے بھی ہم ایک قوم کی حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکتے۔ اگر ہم دوسری قوموں کو مغلوب نہیں کرینگے تو یقینی بات ہے۔ کہ ہم خود ذہنی طور پر ان سے مغلوب ہو جائیں گے۔ اور ذہنی غلامی ہمیشہ سیاسی غلامی کا پیش خیمہ ہوتی ہے:-

تعلیمی مسئلہ زندگی اور موت کی اہمیت رکھتا ہے

اس زمانہ میں قومیں اپنے نظریات زندگی کی بنا پر متحد ہو رہی ہیں ہر قوم چاہتی ہے کہ اپنے نظریۂ زندگی کو ماننے والے افراد یا اقوام کی تعداد میں اضافہ کر کے اپنے آپ کو اور طاقتور بنائے اس غرض کے لئے وہ پراپیگنڈا کے تمام جائز یا ناجائز ذرائع کو کام میں لاتی ہے جس حد تک کہ کوئی قوم کسی دوسری قوم کے نصب العین کے اثرات کو قبول کرتی ہے اس حد تک وہ خود کمزور ہو جاتی ہے اور اس کی حریف قوم طاقتور ہو جاتی ہے اگرچہ وہ قوم اپنی کمزوری یا حریف قوم کی طاقت کا فوری احساس نہ کرے ہر قوم ہر دوسری قوم کی دشمن ہے اور اس کی قوت کو سلب کر کے اپنی قوت میں اضافہ کرنا چاہتی ہے اور لہذا اس کے ساتھ ایک نہ ختم ہونے والی جنگ میں مصروف رہتی ہے قومیں توپ تفنگ کے ساتھ تو شاذ و نادر ہی ایک دوسرے کے مقابلہ پر آتی ہیں لیکن

تصورات کے آلات کے ساتھ وہ ہر آن اور ہر لمحہ ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتی رہتی ہیں اور تصورات کے حملے توپ تفنگ کے حملوں سے کہیں زیادہ خطرناک اور تباہ کن ہوتے ہیں۔

ذہنی محاذ اور فوجی محاذ کا مقابلہ

جب ایک قوم ذہنی محاذ پر شکست کھا جاتی ہے تو خواہ اس کی فوجی طاقت کیسی ہی زبردست ہو وہ فوجی محاذ پر لڑنے کے قابل نہیں رہتی۔ بلکہ خود بخود ہتھیار ڈال کر دشمن کے ساتھ مل جاتی ہے۔ اس کے برعکس جب کوئی قوم ذہنی محاذ پر اپنے آپ کو مضبوط اور مستحکم کرنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ تھوڑی سی فوج کے ساتھ دشمن کی فوج کو شکست دے لیتی ہے۔ اور اگر دشمن اسے فوجی لحاظ سے مغلوب بھی کرے تو اس کا غلبہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا اس حقیقت سے پتہ چلتا ہے کہ ذہنی محاذ فوجی محاذ کے مقابلہ میں کس قدر زیادہ اہم ہے کہا جاتا ہے کہ دشمن پر حملہ کرنے میں پہل کرنا دشمن کے حملہ سے محفوظ رہنے کا بہترین طریقہ ہے یہ اصول جس قدر فوجی محاذ کی صورت میں درست ہے اسیقدر ہی ذہنی محاذ کی صورت میں بھی درست ہے اس اصول پر عمل کرتے ہوئے ہمارے دشمن مدت سے ہمارے خلاف اپنے تصورات کے حملہ کو شروع کر چکے ہیں۔ اگر ہم اس حملہ کا مؤثر جواب نہ دیں تو ہماری زندگی خطرہ میں رہے گی۔ اپنی قوم کو دوسری قوموں کے غلط تصورات کے تباہ کن اثرات سے بچانے کے لئے ضروری ہے کہ ہم فوراً دوسری قوموں کے خلاف علمی اور عقلی تصورات کے پرامن آلات کے ساتھ جارحانہ کارروائی کا آغاز کریں اور جب تک ہمیں مکمل غلبہ حاصل نہ ہو جائے اسے متواتر جاری رکھیں ورنہ ان کے تصورات کا اثر ہمارے اعتقاد اور یقین کو سلب کرتا چلا جائے گا۔ اور ہم ذہنی اور سیاسی لحاظ سے کلیتہً مغلوب ہو جائیں گے۔

ذہنی محاذ پر غیروں کا غلبہ جاری ہے

ذہنی کارزار میں فی الفور اپنی پوری قوت کے ساتھ اترنے میں پس و پیش کرنے کا سبب یا تو ہماری لاعلمی ہے کہ ہم جانتے ہی نہیں

کہ ہم پر کوئی دشمن حملہ آور ہو رہا ہے وہ ہمیں اپنی محافظت اور مدافعت کی ضرورت ہے اور یا پھر ہم اس حملہ کے ممکن نقصانات کا اندازہ نہیں کر سکتے اور اپنے آپ کو اس قدر مضبوط اور مستحکم سمجھتے ہیں کہ کسی مدافعت کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے ۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ اس وقت ہماری قوم میں جس قدر اختلافات موجود ہیں وہ غیر اسلامی نظریات کے اثر کا نتیجہ ہیں اشتراکیت ۔ قومیت پرستی ۔ نسل پرستی اور صوبہ پرستی کے امراض جس حد تک ہمارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں ان کے پھیلنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم اسلامی تصورات کی محبت سے محروم ہو گئے ہیں کیونکہ اب تک اس محبت کی رو کو تازہ بتازہ جسد ملت کے ہر ایک حصہ تک پہنچاتے رہنے کے لئے ہمارے پاس کوئی نظام تعلیم موجود نہیں تھا اور جس حد تک ہم اسلامی تصورات کی محبت سے محروم ہوئے ہیں، اسی حد تک غیر اسلامی تصورات کی محبت ہمارے دل میں متمکن ہو گئی ہے

اگر ہم نے اپنے ملک کے لئے ایک اسلامی نظام تعلیم کی تعمیر میں دیر کی تو ہم اعتقادی اور اخلاقی لحاظ سے دن بدن کمزور ہوتے چلے جائیں گے ۔ کسی قوم کی اعتقادی یا اخلاقی قوت یعنی نصب العین کی محبت اسکی تمام قوتوں کا سرچشمہ ہوتی ہے اس پر قوم کی وحدت اور تنظیم کا دارومدار ہوتا ہے اور اسی کی بنیادوں پر قوم کی فوجی اور اقتصادی قوتیں تعمیر پاتی ہیں اگر نصب العین کی محبت کمزور ہو جائے تو قوم کی ساری قوتیں کمزور ہو جاتی ہیں۔

ذہنی غلبہ کی دوڑ

ہم چاہیں یا نہ چاہیں لیکن ہم دوسری قوموں کے ساتھ ایک ایسی دوڑ میں شریک ہیں جس میں ہر قوم نے جان کی بازی لگا رکھی ہے جو قوم اس دوڑ میں ہار جائے اسکی سزا یہ ہے کہ اسے مٹا دیا جاتا ہے اور جو جیت جائے اس کا انعام یہ ہے کہ دوسری قومیں اس کی غلام بنا دی جاتی ہیں۔ ہمیں سوچنا چاہیئے کہ ہم اس دوڑ میں جیت رہے ہیں۔ یا ہار رہے ہیں ہر دوڑ کی طرح اس دوڑ میں بھی وقت کا پہلو نہایت اہم ہے جو قوم وقت ضائع کرے گی خواہ وہ کیسی ہی طاقتور ہو ضرور ہار جائیگی ۔ اگر ہم نے وقت ضائع کیا تو

اس میں ذرا شبہ نہیں کہ دوسروں کے تصورات و معتقدات کا سیلاب ہمیں گھیرتا چلا جائیگا اور اگر ہم نے عجلت سے کام لیا تو ہم نہ صرف اس سیلاب سے محفوظ رہینگے۔ بلکہ ہمارے اعتقادات و تصورات کا سیلاب دوسروں کو اپنے گھیرے میں لے لیگا۔ افسوس ہے کہ ہم نے ابھی تک اسبات کو پوری طرح سے نہیں سمجھا۔ کہ تعلیم کا معاملہ محض تعلیمی نوعیت کا نہیں بلکہ سیاسی نوعیت کا ہے اور ہماری زندگی اور موت اس کے ساتھ وابستہ ہے۔

کسی قوم کی تاریخ میں زندگی اور موت کو پیدا کرنے والے عوامل کے اثرات چند سالوں بلکہ بعض وقت چند صدیوں میں بھی نمودار نہیں ہوتے۔ لیکن اس کے باوجود یقینی نمودار ہوتے ہیں اور ان کا اثر روکا نہیں جا سکتا۔ اگر کوئی قوم زندہ ہو رہی ہے تو کوئی مبالغہ نہیں کہ دنیا اس کی زندگی اور طاقت کا مشاہدہ آج کرے یا چند صدیوں کے بعد۔ دنیا ضرور اس کی زندگی اور طاقت کا مشاہدہ کرے گی۔ اسی طرح سے اگر کوئی قوم مر رہی ہے تو یہ معمولی بات ہے کہ لوگ اسکی موت کا نظارہ آج دیکھیں یا چند صدیوں کے بعد اس کی موت لامحالہ دنیا کے سامنے آجائیگی۔ ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ ہم مر رہے ہیں یا زندہ ہو رہے ہیں۔ دو ہی صورتیں ممکن ہیں یا ہم اپنے اعتقادات کی حفاظت نہ کرنے سے ذہنی طور پر دوسروں کے غلام بن جائیں گے اور پھر ہماری سیاسی آزادی بھی خطرہ میں پڑ جائے گی اور یا پھر ہم اپنے معتقدات سے دوسروں کو ذہنی طور پر مغلوب کر کے ان کی سیاست پر غالب آجائیں گے موت اور زندگی اور غلامی اور آزادی کی راہوں کے درمیان دنیا کی کسی قوم کے لئے کوئی مقام نہیں ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ ہمارا رخ کس طرف ہے۔ ذہنی آزادی کی طرف یا ذہنی غلامی کی طرف زندگی کی طرف یا موت کی طرف؟ اگر آزاد ہونے کے بعد اب بھی ہم اپنے نظام تعلیم کو بدل کر اپنے نظریۂ زندگی کے مطابق نہیں بنا سکے تو ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب نہایت ہی دلخراش اور اندوہناک ہے۔

ذہنی غلامی کا نتیجہ سیاسی غلامی اور موت ہے۔

کسی قوم کا امتیازی نشان جو اسے دوسری قوموں سے الگ ایک قوم بناتا ہے اور اس کی ہستی کا ثبوت ہوتا ہے اس کا اعتقاد یا اس کا تصورِ حیات ہی ہوتا ہے۔ غلامی اصل میں ذہنی غلامی ہے اور آزادی ذہنی آزادی۔ جو قوم سیاسی غلامی کے باوجود اپنے نظریۂ زندگی پہ قائم رہ سکتی ہے اور اسے فی الواقعہ اپنے فکر و عمل کا مدار و محور بنا سکتی ہے۔ وہ درحقیقت آزاد ہے اس کے برعکس سیاسی آزادی کے ہوتے ہوئے جس قوم کے فکر و عمل کی بنیاد غیروں کے معتقدات پہ ہو وہ آزادی کے باوجود غلام ہے سیاسی آزادی کسی قوم کے نزدیک مقصود بالذات نہیں ہوتا۔ بلکہ ہر قوم سیاسی آزادی کو اپنی ذہنی آزادی کی خاطر حاصل کرتی ہے۔ خود ہم نے پاکستان کے لئے جو عظیم الشان قربانیاں دیں اسکی وجہ یہ تھی کہ ہم چاہتے تھے، کہ اپنے نصب العین حیات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ ہم ہندوؤں سے الگ ایک قوم ہونے کے مدعی اس بنا پر ہیں کہ ہمارا تصورِ حیات ہندوؤں کے تصورِ حیات سے مختلف ہے جس طرح سے ہر قوم کی آزادی ذہنی آزادی ہے اسی طرح سے ہر قوم کی شکست ذہنی شکست ہے اور فتح ذہنی فتح ہے، کوئی قوم فوجی شکست سے اس وقت تک پریشان نہیں ہوتی جب تک کہ اسے یقین نہ ہو کہ اس کا نتیجہ ذہنی شکست ہوگا اور کوئی قوم فوجی فتح سے اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتی، جب تک کہ اسے یقین نہ ہو کہ اس کا نتیجہ ذہنی فتح ہوگا۔ لیکن قوموں کی بدقسمتی یا خوش قسمتی سے فوجی شکست ہمیشہ ذہنی شکست پر اور فوجی فتح ہمیشہ ذہنی فتح پر ختم ہوتی ہے۔

فوجی فتح کا مقصد ذہنی غلبہ ہے

جب کوئی قوم دوسری قوم پر فوجی لحاظ سے غلبہ حاصل کرتی ہے تو وہ سب سے پہلے اس کا نظام تعلیم موقوف کر کے اپنا نظام تعلیم اس پر ٹھونستی ہے انگریزوں نے ہندوستان پہ اپنا تسلط جماتے ہی ہندوستان میں ایک نیا نظام تعلیم جاری کیا جو ان کے اپنے مقاصد کے مطابق تھا۔ اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کی ایک کثیر تعداد مغربی معتقدات سے متاثر ہے۔ یہی انگریزی

نظام تعلیم اب تک ہم پر مسلط چلا آتا ہے پھر گزشتہ جنگ عظیم کے بعد اتحادیوں نے جاپان
جرمنی اور اٹلی پر قبضہ کیا تو انہوں نے بھی سب سے پہلے ان ملکوں کا نظام تعلیم ہی بدلا
پھر جب ایک ہی قوم کے اندر کوئی نئی پارٹی جو ایک نئے نظریہ زندگی پر اعتقاد رکھتی ہو
مخالف پارٹی کو شکست دے کر اندرونی انقلاب بپا کرتی ہے تو برسر اقتدار آنے
کے بعد اس کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ ملک کے نظام تعلیم کو بدل دیتی ہے ہٹلر
مسولینی اور لینن کے بپا کئے ہوئے انقلابات کے بعد یہی ہوا۔ فاتح قوم یا فاتح
پارٹی بجا طور پر سمجھتی ہے کہ جب تک مفتوح قوم یا مفتوح پارٹی اپنے معتقدات پر جمی
ہوئی ہے اس کی فتح مکمل نہیں ہوئی اور ہر وقت شکست میں بدل سکتی ہے۔ یہ
واقعات فطرت انسانی کے جن حقایق کا پتہ دیتے ہیں ان کی روشنی میں ہمیں سوچنا چاہیئے
کہ ہندوؤں کے خلاف ہماری آزادی کی مہم جس کا ایک نتیجہ قیام پاکستان کی صورت میں ظاہر
ہوا تھا مکمل طور پر کامیاب ہو گئی ہے یا نہیں۔ اور کیا اسے جس قدر کامیابی اب تک
حاصل ہوئی ہے وہ محفوظ ہو گئی ہے یا نہیں۔ بلا تردد میرا جواب یہ ہے کہ اس مہم کی کامیابی
ہنوز مکمل نہیں ہوئی اور جس قدر کامیابی اسے اب تک حاصل ہوئی ہے وہ بہت ہی کم ہے
اور ہر وقت شکست میں بدل سکتی ہے۔

تعلیم کا مقصد محبت نصب العین کو کمال پر پہنچانا ہے

ہر شخص میں اس کی خودی کی فطرتی محبت جو تصور حسن یا نصب العین کے لئے مخصوص
ہوتی ہے ایک خاص مقدار میں موجود ہوتی ہے۔ اس محبت
کی مقدار مختلف اشخاص میں بالعموم ان کی ذہانت کی نسبت سے
مختلف ہوتی ہے جس قدر کوئی شخص زیادہ ذہین اور تیز فہم ہوتا ہے اسی قدر وہ اپنے
نصب العین سے زیادہ شدید محبت کر سکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ذہین لوگوں کے
جذبات زیادہ تیز اور قوی ہوتے ہیں۔ چونکہ خودی کی محبت کی مقدار محدود ہے اس کا
جس قدر حصہ وہ ایک مقصد کے لئے صرف کرے گی دوسرا مقصد جو اس کے ماتحت نہ ہو بلکہ

اس سے متناقض اور مختلف ہو۔ اسی حد تک اسکی محبت سے محروم ہو جائیگا۔ خودی کی
تربیت کے ابتدائی مراحل میں خودی کی محبت ایک سے زیادہ تصورات کے درمیان
منقسم ہوتی ہے اور تصور کی محبت کمال کے اس درجہ پر نہیں ہوتی جو خودی کی فطرتی
استعداد محبت کی رو سے اس کے لئے پانا ممکن ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ ایک تصور خودی
کی محبت کا مرکز بن جاتا ہے اس تصور کی محبت ترقی کرتی جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی
اسی نسبت سے دوسرے تصورات کی محبت کم ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ اس کی محبت
اپنی انتہا پر پہنچ جاتی ہے اور دوسرے تصورات کی محبت مٹ جاتی ہے جب یہ صورت
پیدا ہوتی ہے تو انسان کو ایک تربیت یافتہ متحد اور منظم شخصیت حاصل ہو جاتی ہے۔
ہر نظام تعلیم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جس نظریہ زندگی کے ماتحت وہ وجود میں آیا ہے
اسکی محبت کو نقطۂ کمال پر پہنچائے اور دوسرے مخالف تصورات کی محبت کو کلیۃً مٹا
دے تعلیمی عمل کے دو پہلو ہیں ایک کسی مخصوص تصور کی محبت کو ترقی دینا اور دوسرا اس کے
مخالف تصورات کی محبت کو مٹانا اور یہ دونوں پہلو ایک دوسرے کے مؤید ہیں اور
ایک دوسرے کے ساتھ لازم اور ملزوم ہیں۔ اگر ہم ایک کو نظر انداز کریں تو دوسرا خود بخود
نظر انداز ہو جاتا ہے مخالف تصورات کی محبت کا کم ہونا اور موافق تصورات کی محبت کا ترقی
کرنا ایک ساتھ اور بیک وقت عمل میں آتا ہے جس طرح سے ترازو کے ایک پلڑے کے اوپر اٹھنے
سے دوسرا پلڑا خود بخود نیچے گرتا ہے جس قدر مخالف تصورات کی محبت کم ہوگی۔ اسی قدر
موافق تصورات کی محبت ترقی کریگی اور اس کے برعکس جس قدر مخالف تصورات کی محبت
زیادہ ہوگی اسی قدر موافق تصورات کی محبت کم ہوگی جب تک ہمارے ہر فرد کے دل میں
اس کے اپنے نظریہ زندگی کی محبت کمال کے اس نقطہ پر نہ پہنچ جائے، جو اس کی فطرتی
صلاحیتوں نے مقرر کر رکھا ہے اس وقت تک ہم دوسرے تصورات اور اعتقادات کو اپنی
محبت میں شریک کرتے رہینگے اور اس وقت تک کمزور اور غیر متحد اور غیر منظم رہیں گے۔

ان حقائق کی بنا پر ضروری ہے کہ ہمارا نظام تعلیم اس قسم کا ہو جس سے نہ صرف طالبعلم کے دل میں صحیح تصور کی محبت نشو و نما پائے بلکہ جس کے ماتحت غلط اور مخالف تصورات کی محبت کا فروغ ناممکن ہو جائے اس غرض کے لئے ضروری ہوگا کہ ہم کچھ عرصہ کے لئے ان تصورات کے اثر کو کسی راستہ سے بھی طالب علم تک پہنچنے نہ دیں۔ اور پھر جب طالب علم کو ان تصورات سے واقف کرنے کا وقت آئے تو ان کے مخالفانہ اثر کو باطل کرنے کے لئے اس کو ان کی غلطیوں اور خامیوں سے واقف کریں۔

طالبعلم کے ماحول کی تشکیل

ہر چیز جو مدرسہ کی فضا کی تشکیل میں حصہ لیتی ہے۔ خواہ ہمارے نزدیک کیسی ہی معمولی اور ناقابل اعتنا ہو طالب علم کی نصب العینی تعلیم کا ذریعہ بنتی ہے اگر ہم اسے اپنے تصور زندگی کی تعلیم کے لئے کام میں نہ لائیں گے۔ تو وہ خود بخود دوسرے غلط اور مخالف تصورات زندگی کی تعلیم کا ذریعہ بنجائیگی آخر کار نہ صرف مدرسہ کی فضا بلکہ طالب علم کی زندگی کا سارا ماحول اس کی نصب العینی تعلیم (Ideological education) کا ذریعہ بنتا ہے۔ لہذا اگر ہم اس کو صحیح نصب العین حیات کی تعلیم دینا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے ضروری ہوگا کہ ہم اس کے سارے ماحول کو نصب العین کے مطابق بنائیں اس ماحول کا سب سے بڑا جزو خود ریاست ہے جب تک ریاست کی ساری سرگرمیاں نصب العین کیلئے وقف نہ ہونگی محض مدرسہ کی فضا کو نصب العینی رنگ دینے سے طالب علم کی محبت نصب العین اپنے کمال پر نہ پہنچ سکے گی۔ جب وہ مدرسہ کی فضا سے باہر آئے گا۔ تو گھر، بازار۔ کلب مجلس۔ سینما۔ ریڈیو۔ پریس اور پلیٹ فارم (Platform) سب تیار ہونگے کہ اس کی مشکل سے جمع کی ہوئی محبت کو دوسرے تصورات کے سپرد کردیں۔ طالبعلم کے ماحول کو ممکن حد تک تصرف میں لانے کے لئے ہی یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ رہائشی مدرسوں (Residential institutions) کے ذریعہ سے اس کے دن رات کے تمام مشاغل کی نگرانی کی جائے لیکن رہائشی ادارات تعلیم طالب علم کے سارے ماحول کو تصرف

میں نہیں لا سکتے۔ جب تک کہ خود ریاست اپنی ساری سرگرمیاں کلیتہً نصب العین کے لئے وقف نہ کر دے۔

میرے اس فقرے پر کہ ہمارے لئے ضروری ہوگا، کہ "ہم کچھ عرصہ کے لئے مخالف

آزادیٔ رائے اور رواداری کے اصول

اور غلط تصورات کے اثر کو کسی راستے سے بھی طالب علم تک پہنچنے نہ دیں"۔ شاید وہ حضرات جو آزادیٔ رائے کے متعلق بعض مغربی اقوام کے غلط پروپیگنڈا سے متاثر ہیں چیں بجبیں ہوں کہ یہ تو وہی انسان کی ذہنی نشو و نما کو روک دینے والی غلامی ہے جو بعض فسطائی حکومتوں نے لوگوں پر مسلط کر رکھی ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ ہر قوم آزادیٔ رائے کا نام اسی وقت تک لیتی ہے جب تک کہ وہ اپنی لاعلمی کی وجہ سے غلط اور صحیح رائے میں تمیز کرنے سے قاصر ہوتی ہے اور نہیں جانتی کہ کون سی رائے اس کے قومی نصب العین کو کمزور کرنے والی ہے اور کون سی نہیں۔ ورسچ بات یہ ہے کہ اس وقت تک ہر قوم خود اپنے نصب العین حیات کی رو سے آزادیٔ رائے کا ڈھنڈورا پیٹنے میں حق بجانب بھی ہوتی ہے اور اسے اس کا ڈھنڈورا پیٹتے رہنا چاہیئے۔ کیونکہ جب تک کوئی شخص اپنی منزل مقصود کو نہیں پہچانتا اور نہیں جانتا کہ وہ کس سمت کو چل کر وہاں پہنچ سکتا ہے اس وقت تک اگر وہ چلتے چلتے کسی رکاوٹ سے ٹھوکر کھا کر دائیں یا بائیں طرف مڑ جائے یا مخالف سمت میں چلنے لگ جائے تو اسے شکایت کا حق نہیں پہنچتا اور نہ ہی اس کے دل میں کوئی شکایت پیدا ہوتی ہے۔

تمام قوموں سے زیادہ جمہوریت اور آزادی کا نام لینے والی قوم امریکہ ہے لیکن آج امریکہ کو معلوم ہو گیا ہے کہ اشتراکیت کا تصور اس کے نصب العین حیات کا مخالف ہے۔ لہٰذا آج امریکہ کی حکومت ان امریکنوں کے ساتھ جنکے متعلق یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اشتراکی افکار کیساتھ ہمدردی رکھتے ہیں جو برتاؤ کر رہی ہے وہ دنیا کے سامنے ہے ہیرالڈ جے لاسکی Harold J. Laski سچ کہتا ہے کہ اگر روسی جمہوری سرمایہ داری

افکار کو بدتر و اتصورات کے نام سے دباتا ہے تو امریکہ اشتراکی افکار کو بے راہ روی (licENSE) کے نام سے دباتا ہے آزادیٔ رائے درا صل دونوں کے یہاں مفقود ہے۔

جب آئینسٹائن (EiNstien) جرمنی سے بھاگ کر امریکہ آیا تو امریکہ کے نام نہاد جمہوریت اور آزادی کے پرستاروں نے شور برپا کر دیا کہ ہٹلر کی جرمنی میں سائنسدانوں کو بھی آزادی حاصل نہیں۔ لیکن اب وہی آئینسٹائن ہے جو اشتراکیت نوازی کے الزام میں امریکی حکومت کے زیر عتاب ہے گزشتہ فروری کے مہینہ میں امریکی حکومت نے ڈاکٹر بائس (Dr. Bois) ایک مشہور امریکی پروفیسر اور مصنف کو اس الزام میں پکڑ لیا تھا۔ کہ وہ مرکز اطلاعات امن امریکہ (Peace Information Centre of U. S. A.) کا صدر رہ چکا ہے اور حال ہی میں حکومت انگلستان نے ایک روسی فلم ڈایریکٹر اور ایک چینی شاعر کو اس بنا پر انگلستان آنے کی اجازت نہیں دی کہ وہ انگلستان کی مجلس امن (British Peace Committee) کے ایک اجلاس میں بطور مندوبین کے شریک ہو رہے ہیں۔ ہم مغرب کے پراپیگنڈا سے بہت جلد فریب کھا جاتے ہیں کوئی قوم مشرق میں رہتی ہو یا مغرب میں اپنی فطرت کے خلاف کچھ نہیں کر سکتی۔ دنیا کی کوئی قوم اپنے نصب العین حیات کے خلاف کوئی اقدام گوارا نہیں کر سکتی۔ خواہ وہ اپنوں کی طرف سے ہو اور خواہ بیگانوں کی طرف سے اور نہ ہی اسے گوارا کرنا چاہیئے۔

جو افکار و آرا صحیح تصور حیات کے نقیض اور مخالف ہوں اور ان سے لوگوں کے اعتقاد اور یقین کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو ہمیں حق پہنچتا ہے کہ ہم ان کی نشر و اشاعت کو سختی سے روک دیں ہر راہ عمل خواہ انسان اسے دوسروں کے دباؤ کے بغیر خود بخود اختیار کرے آزادی کی راہ نہیں ہوتی۔ فرد کو آزادی صرف ایک راہ پر حاصل

ہو سکتی ہے اور اس کے علاوہ باقی جس قدر راہیں ممکن ہیں وہ ریب غلامی کی راہیں ہیں۔
آزادی کا راستہ وہی ہے جس پر چل کر خودی اپنے فطرتی نفسیاتی رجحانات کو مطمئن
کر سکتی ہے جو اسکی تربیت اور ترقی کا راستہ اور مکمل تصور حسن کی جستجو کا راستہ ہے
جونہی کہ خودی اس راستہ کو چھوڑتی ہے خواہ وہ اسے خود بخود بغیر کسی باؤ کے چھوڑے وہ
اپنے مخالف تصورات کی غلام ہو جاتی ہے گو وہ اپنی جہالت سے اسے آزادی ہی سمجھتی
رہے۔

اگر ہم نارواداری کا صحیح استعمال جانتے ہوں تو وہ مفید ہے مضر نہیں تعلیم کا
حاصل یقین اور اعتقاد کی نشوونما ہے یہ کتنی بڑی غلطی ہے کہ ہم ایک طرف سے یقین و
اعتقاد کی تعمیر کریں اور اسکی تعمیر کیلئے سو طرح کی مصیبتیں اٹھائیں اور دوسری طرف سے
جو کچھ تعمیر کریں اسے گراتے چلے جائیں۔ اس بڑھیا کی طرح جو دن بھر سوت کاتتی ہے
اور شام کو اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے نارواداری تعلیم ہی کا ایک جزو ہے اور
اسی کا ایک پہلو ہے جس سے تعلیم کے فوائد محفوظ کئے جاتے ہیں اگر ایک فادر زہر آزمودہ
بھی ہو تو اس پر بھروسہ کر کے جسم کے اندر زہر کا ٹیکہ نہیں لگایا جا سکتا اگر ہم مریض کا
علاج ضروری سمجھتے ہوں تو ہمیں پرہیز کو بھی ضروری سمجھنا چاہیئے۔

درا صل اس وقت آزادی رائے اور رواداری کے حق میں اور غلامی رائے
اور نارواداری کے خلاف جس قدر پراپیگنڈا دنیا میں موجود ہے
اسکی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ ابھی تک انسان اپنے آپ کی واقفیت

انسان ابھی خود شناسی کے ابتدائی مراحل میں ہے

کے بالکل ابتدائی مراحل میں سے گزر رہا ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ اس کی خودی کے اصلی
اور صحیح تقاضے کیا ہیں اور نفسیاتی سطح حیات پر کونسی چیز اس کے لئے مفید ہے اور
کونسی مضر۔ آئندہ جب فطرت انسانی کے علم کی ترقی سے یہ مشکل رفع ہو جائے گی۔
اور اس بات کی واقفیت خواص کے دائرہ سے نکل کر عوام تک جا پہنچے گی کہ انسان کی زندگی

کا صحیح مقصد یا دوسرے لفظوں میں کامل ترین تصور حیات کیا ہے تو ہم افکار و آرا کے معاملہ میں فرد کی بہتری کے لئے اور نیز اس جماعت کی بہتری کے لئے جس کا وہ رکن ہے فرد کے ساتھ ضروری حد تک سختی کا برتاؤ کرنا اپنا مقدس فرض سمجھیں گے آج ہم کو حفظان صحت کے قوانین کی یقینی واقفیت حاصل ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم ان قوانین کا جبری نفاذ کرتے ہیں ایک مہذب ملک میں جو شخص شہر کی سڑک پر نجاست پھینکتا ہوا پکڑا جائے اس کی جگہ قید خانہ تجویز کی جاتی ہے اور اس پر کسی کو تعجب نہیں ہوتا۔ خودی کے علم کی ترقی کا ایک دور ایسا اب بھی آنے والا ہے جب ہم خودی کی صحت اور تندرستی کے قوانین پر بھی اسی یقین اور اعتقاد کے ساتھ حاوی ہونگے جس طرح سے آج ہم جسم کی صحت اور تندرستی کے قوانین پر حاوی ہیں۔ پھر وہ شخص جو ایک مجمع عام میں قومی استعماریت (National Imperialism) یا جدلی مادیت (Dialectical Materialism) کے حق میں تقریر کرے گا۔ ہمیں ایسا ہی نظر آئے گا جیسے کوئی شخص شہر کی صاف ستھری سڑکوں پر نجاست بکھیر رہا ہو۔ اور اگر اسے قید خانہ میں بھیج دیا جائے گا۔ تو کسی کو تعجب نہیں ہوگا۔

میرا مطلب یہ نہیں کہ ہم طالب علم کو تمام غیر اسلامی بیرونی تصورات سے الگ کرکے ایک ثقافتی جزیرہ کے اندر اس کی تربیت کریں۔ طالب علم کے لئے ضروری ہے

باطل تصورات کی واقفیت طالبعلم کی تربیت کے لئے ضروری ہے

کہ وہ اپنی تعلیم و تربیت کے ایک مرحلہ پر ہر قسم کے اچھے اور برے تصورات سے تعارف پیدا کرے۔ لیکن یہ اسی وقت ہونا چاہیئے جب اس کے اپنے نصب العین کی محبت اور اس کی ذہنی قوتیں اس حد تک ترقی کر چکی ہوں کہ وہ غلط تصورات کو غلط اور صحیح کو صحیح سمجھ سکے۔ اور پھر استاد کو چاہیئے کہ طالب کو نیک و بد تصورات کا تعارف کرانے کے بعد نیک کو بد سے تمیز کرنے میں اس کی مدد کرے۔ یعنی اس کی تحقیق و تنقید اور فہم

ادراک کی قوتوں کی رہنمائی اس طرح سے کرے کہ وہ خود بخود اچھے تصورات کو برے تصورات سے تمیز کر سکے۔ ہمیں ہر حالت میں اس بات کا اہتمام کرنا چاہیئے کہ غلط تصورات سے اس کے اپنے اعتقاد کو نقصان نہ پہنچے بلکہ اس کا اعتقاد اور مضبوط اور مستحکم ہو جائے اگر ہم اپنے نصب العین سے پیدا ہونے والے تصورات کے علاوہ باقی تمام نصب العینوں سے پیدا ہوتے والے افکار و آرا کو کلیتہً مسدود کر دیں۔ تو طالب علم کی ذہنی نشوونما رک جائے گی اور اس کے اپنے نصب العین کا علم بھی ترقی نہیں کریگا اور اسکی تربیت پر بڑا اثر پڑے گا۔ صداقت کا علم کبھی اتنا واضح اور صاف نہیں ہوتا۔ جتنا کہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم صداقت کو دروغ کے مقابلہ پر لائیں اگر ہم تاریکی سے ناآشنا ہوتے تو روشنی ہمارے لئے ایک بے معنی چیز ہوتی۔ اس دنیا میں حق و باطل کی آمیزش ہر جگہ موجود ہے اور ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنے نوجوانوں کو دونوں میں تمیز کرنے اور حق کو اپنانے اور باطل کو ترک کرنے کی طرف رہنمائی کریں۔

سیرت قومی کے نقائص کا علاج

ہم میں سے بعض درد دل رکھنے والے اشخاص جب اپنی قومی سیرت کی کمیوں اور کوتاہیوں کو دیکھتے ہیں تو بہت کڑھتے ہیں کیونکہ اس میں شک نہیں کہ دوسری قوموں کی نسبت ہم اپنی حیوانی یا جبلتی خواہشات کی کی خاطر قومی ملی یا نصب العینی مفاد کو نظر انداز کرنے کے لئے بہت جلد آمادہ ہو جاتے ہیں چنانچہ دوسری قوموں کی نسبت ہم میں غدار۔ رشوت خوار۔ دوست نواز۔ نسل پرست، جاہ طلب، صوبہ پرست، خاندان پرست، مسرف حریص اور اخلاق باختہ افراد کی تعداد زیادہ ہے۔ اگرچہ یہ صورت حال افسوسناک ہے لیکن ہمیں ناامید یا پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس لئے کہ یہ سب ایک ہی مرض کی علامتیں ہیں اور ان کا علاج آسان ہے یہ مرض نصب العین کی محبت کا انحطاط ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ غلامی کی وجہ سے ہم عرصۂ دراز سے اپنی قوم کی تعلیم اور تربیت اپنی مرضی کے مطابق نہیں کر سکے اور لہذا

انکی تعلیم و تربیت غلط طور پر ہوتی رہی ہے اور غلط تعلیم و تربیت کی وجہ سے ہماری قوم کے افراد کے دلوں میں ان کے اپنے نصب العین کی محبت کی بجائے دوسرے نصب العینوں کی محبت پرورش پاتی رہی ہے۔

انگریز کا نظام تعلیم ہمارے دلوں میں اسلامی تصورات کو کمزور کرکے مغربی قومیت کے تصورات کی نشو ونما کرتا رہا ہے اگرچہ وہ اسلامی اعتقادات کی محبت کو پوری طرح سے نہیں مٹا سکا لیکن اسکو بے حد کمزور کر گیا ہے اور اگرچہ وہ مغربی تصورات کی محبت کو پوری طرح سے غالب نہیں کر سکا لیکن اسکو بے حد طاقتور کر گیا ہے اب ہم نہ تو پکے مسلمان رہے ہیں اور نہ ہی پکے مغربی قومیت پرست۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہماری قومی سیرت جو اسلامی نصب العین حیات کے ماتحت ہندوؤں یا انگریزوں کی سیرت سے زیادہ بلند اور پختہ ہونی چاہیے تھی اب ان سے بھی پست تر ہے۔ اگرچہ ہندو بھی ہماری طرح انگریزی نظام تعلیم کے زیر اثر رہے ہیں لیکن ان کے ہاں وہ صورت پیدا نہیں ہوئی جو ہمارے ہاں پیدا ہوئی ہے ہندوؤں کے ہاں مغربی قومیت پرستی کے تصورات انگریزی نظام تعلیم کی بدولت مکمل فتح حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں کیونکہ ہندوؤں کے نصب العین حیات میں اسلام کی طرح کی کوئی چیز ان تصورات کے مقابلہ پر موجود نہیں تھی۔

جب مرض کی نوعیت اس کی علامات اور اس کا سبب واضح طور پر معلوم ہوں تو اس کا علاج آسان ہوتا ہے، نصب العین کی محبت کا زوال ہمارا اصل مرض ہے ہماری اخلاقی کوتاہیاں اس کی علامات ہیں، غلط اور غیر اسلامی نظام تعلیم اس کا سبب ہے۔ لہذا اس کا علاج صحیح اور اسلامی نظام تعلیم ہے۔ اب جبکہ ہم آزاد ہیں ہم اس علاج پر قدرت رکھتے ہیں اب ہم اپنے نظام تعلیم کو بدل کر اپنی قومی سیرت کو جس قدر چاہیں بلند کر سکتے ہیں اگر ہم اس علاج سے اب بھی

غافل رہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم بیماری اور نقاہت کو صحت اور طاقت پر
ترجیح دے رہے ہیں۔

اسلامی نظامِ تعلیم سے کیا مراد ہے

اسلامی نظامِ تعلیم سے میری مراد ایسا نظامِ تعلیم نہیں جس میں
اسلامی نظریۂ حیات دینیات یا اسلامیات کے نام سے ایک
جزو کے طور پر موجود ہو۔ بلکہ ایسا نظامِ تعلیم جو خود اسلامی نظریۂ زندگی کا ایک جزو ہو
جس کا مقصد اسلامی نظریۂ زندگی کی تائید اور اعانت کے سوائے اور کچھ نہ ہو جس
میں علم سے مراد اسلامی نظریۂ انسان و کائنات ہو اور علم کی تینوں شاخیں یعنی
مادی علوم۔ حیاتیاتی علوم۔ اور نفسیاتی علوم اس نظریہ کی شاخیں سمجھی جائیں۔
قرآن نے اسلام کی تعریف یہ کی ہے کہ وہ انسان کی فطرت ہے۔ اور انسانی
فطرت کا کوئی تصور اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ ساری کائنات کا تصور
نہ ہو۔ یہی سبب ہے کہ قرآن نے ارشاد کیا ہے کہ وہ کائنات کے اسرار پر حاوی ہے
قل انزله الذی یعلم السر فی السموٰت والارض۔
کہو اس کتاب کو اس ذات پاک نے نازل کیا ہے جو زمین اور آسمان کے بھید
جانتا ہے۔
کائنات کے تین طبقے ہیں۔ مادہ۔ حیوان اور انسان۔ انسان کے اندر یہ تینوں
طبقے موجود ہیں۔ لہٰذا انسان چھوٹے پیمانے پر ایک کائنات ہے اگر ہم انسان کو
پوری طرح سے سمجھ لیں تو گویا ہم نے ساری کائنات کو پوری طرح سے سمجھ لیا اور انسان
اور کائنات میں سے اگر ہم کائنات کو پوری طرح سے سمجھ لیں تو پھر انسان کی حقیقت
بھی پوری طرح سے ہماری سمجھ میں آ جائیگی پھر انسان اور کائنات میں سے جس قدر ہماری
واقفیت ایک کے متعلق بڑھیگی۔ دوسرے کے متعلق بھی اسی نسبت سے بڑھیگی۔ علم
کی تین شاخیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے انسان یا کائنات کے تینوں طبقوں کے علوم

ہیں۔

کوئی حقیقی علم یعنی کوئی سچائی یا صداقت اسلام کے خلاف نہیں جا سکتی۔ کیونکہ اسلام بھی صداقت ہے اور صداقت غیر منقسم ہے اس کی ایک سے زیادہ قسمیں یا ایک سے زیادہ حصے نہیں ہو سکتے۔ حق خدا کی صفات میں سے ایک صفت ہے خدا سچ ہے لہذا صداقت خود خدا کا علم ہے اور چونکہ خدا ایک ہے صداقت بھی ایک ہی ہے اس سے یہ ثابت ہوا کہ کوئی شخص کافر ہو یا مسلمان کوئی علمی صداقت ایسی دریافت نہیں کر سکتا جو اسلام کی تائید نہ کرتی ہو اور جس کی تائید اسلام نہ کرتا ہو۔ یہی سبب ہے کہ حضور نے ارشاد فرمایا تھا۔

الکلمۃ الحکمۃ ضالۃ المؤمن فھو احق بھا این وجدھا ترجمہ دانائی کی بات یعنی صداقت مومن کی گم شدہ چیز ہے۔ جہاں چاہے اسے لے لے لیکن کسی علمی صداقت اور اسلام کی مطابقت کی شرط یہ ہے کہ جس چیز کو ہم صداقت کہہ رہے ہوں وہ فی الواقعہ صداقت ہو اور وقت کے گزرنے اور علم کے ترقی پانے سے وہ اور مضبوط مستحکم اور روشن ہو رہی ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ جس چیز کو ہم اسلام کہہ رہے ہوں وہ فی الواقع اسلام ہو اور قرآن کے مطالب کے بارہ میں فقط ہماری غلط فہمیوں اور غلط بینیوں کا دفترنہ ہو۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم ایک چیز کو علمی صداقت سمجھ لیتے ہیں اور وہ صداقت نہیں ہوتی اور ایسا بھی اکثر ہوتا ہے کہ ہم اپنی لاعلمی سے قرآن کی غلط تشریح کرتے ہیں اور اسی کو قرآن یا اسلام سمجھ لیتے ہیں۔

علوم کو دوبارہ مدون کرنے کی ضرورت

اس قسم کے اسلامی نظام تعلیم کی مکمل تعمیر کے لئے ضروری ہوگا کہ ہم موجودہ انسانی اور نفسیاتی علوم پر نظر ثانی کر کے ان کو قرآن کی روشنی میں نئے سرے سے مدون کریں۔ کیونکہ ان علوم کی صحیح تدوین کا دارومدار فطرت انسانی کے صحیح نظریہ پر ہے جس سے مغرب کے حکما بے خبر ہیں

چونکہ انہوں نے ان علوم کو فطرتِ انسانی کے غلط نظریہ پر مبنی کر رکھا ہے لہٰذا ان کی ساری تحقیق غلط طور پر ہوئی ہے میں نے ان کیساتھ مادی اور حیاتیاتی علوم کو شامل نہیں کیا کیونکہ ان علوم میں کسی کافر کے لئے بھی بھٹکنے کی گنجائش نسبتاً کم ہے تاہم جب ہم نفسیاتی علوم کی تدوین سے فارغ ہو جائیں تو ہمیں حیاتیاتی علوم پر بھی نظرِ ثانی کرنے کی ضرورت ہوگی۔ تاکہ وہ بھی صحیح اور اسلامی زاویہ نگاہ سے مدون ہو جائیں حیاتیاتی علوم پر نظرِ ثانی کرتے ہوئے ہمیں نظر آئے گا کہ اکثر مقامات پر حیاتیاتی عمل کی علت کو ٹھیٹھ علمی بصیرت سے سمجھنے میں کفار نے غلطیاں کی ہیں اور ہم اس قابل ہیں کہ خالص علمی نقطۂ نگاہ سے ان غلطیوں کا ازالہ کر سکیں۔

تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ علوم کی نئی تدوین کے بغیر ہم اس قسم کا اسلامی نظامِ تعلیم جاری نہیں کر سکتے، بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے اسلامی نظامِ تعلیم کا اجرا علوم کی نئی تدوین میں مدد کرے گا اور جب تک اسلامی نظامِ تعلیم جاری نہیں ہوگا ہمیں علوم کی نئی تدوین کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔ اور نہ ہی اس کام میں ضروری سہولتیں پیدا ہونگی۔

میرے خیال میں اسلامی نقطۂ نظر سے تدوینِ علوم کی مہم کے آغاز کے طور پر ہماری یونیورسٹیوں کو فی الفور اس بات کا اعلان کرنا چاہیئے کہ تمام علوم جو اس میں پڑھائے جاتے ہیں اسلامی نظریہ کائنات کی شاخیں ہیں اور ہر طالب علم اور استاد کو انہیں اسی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا اور پڑھنا اور پڑھانا چاہیئے اس سے ایک حیرت انگیز نفسیاتی انقلاب ہوگا۔ اور قرآن کے متعلق ہمارا جامد اور متحجر نقطۂ نظر فوراً بدل جائیگا اور ہم قرآن کو ایک نئی روشنی صحیح روشنی میں دیکھنے لگیں گے۔ اس قسم کے اسلامی نظامِ تعلیم میں اسلامیات ایک الگ مضمون کے طور پر رکھنا ضروری ہوگا۔ لیکن موجودہ نظامِ تعلیم میں ایک الگ مضمون کے طور پر اسلامیات کا جوڑ وہ نتائج

پیدا نہیں کر سکتا جو ہمارے مد نظر ہیں۔ بلکہ اس سے یقینی طور پر بر عکس نتائج پیدا ہوں گے کیونکہ اس سے طالب علم کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا۔ کہ اسلام کا علم زیادہ سے زیادہ علم کا ایک الگ شعبہ ہے جو ہر حالت میں نقل پر مبنی ہے اور اس قسم کا عقلی علم نہیں جیسا کہ اسے بعض دوسرے مضامین کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتا ہے اور پھر وہ اپنے اس خیال کا اطلاق اپنی عملی زندگی پر بھی کرے گا۔ اور سمجھیگا کہ مذہب اس کی زندگی کا ایک حصہ ہے اور اس کی ساری زندگی نہیں ظاہر ہے کہ اسلام اور اسلامی زندگی کے متعلق طالب علم کا یہ نقطۂ نظر جو ہم اسلامیات کو یونیورسٹی کا ایک الگ مضمون قرار دینے سے پیدا کرینگے اسلامی نظریۂ زندگی کی محبت کی نشو و نما کے لئے ساز گار نہیں ہوگا۔ حالانکہ ہم چاہتے ہیں اور ہم اپنے نظام تعلیم کا یہ واحد مقصد اور مدعا قرار دیتے ہیں کہ طالب علم کی محبت نہ صرف نشو و نما پائے۔ بلکہ نشو و نما پاکر نقطہ کمال پر پہنچے۔

علمی تحقیق کا نقطۂ آغاز | اس قسم کا اسلامی نظام تعلیم علمی تحقیق اور انکشاف کیلئے ایک نہایت ہی ساز گار ماحول پیدا کرے گا اس کی وجہ یہ ہے کہ علمی تحقیق کی راہ نمائی ہمیشہ مفروضات سے ہوتی ہے جن کو ہم اپنے وجدان سے قائم کرتے ہیں ہم ایک مفروضہ لے لیتے ہیں اور پھر دیکھتے ہیں کہ یہ حقایق کے ساتھ منطبق ہوتا ہے یا نہیں اور حقایق کے اندر ایک تنظیم اور وحدت پیدا کرتا ہے یا نہیں اگر وہ ایسا کرے تو ہم اسے صحیح سمجھتے ہیں اور پھر مزید حقایق کے انکشاف سے اس کی تصدیق ہوتی چلی جاتی ہے۔ اگر کوئی مفروضہ (Hypothesis) علمی حقائق کے ساتھ منطبق نہ ہو یا ان میں تنظیم اور وحدت پیدا نہ کر سکے۔ تو ہم اسے غلط سمجھتے ہیں اور دوسرے مفروضہ کی آزمائش کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہمیں ایک ایسا مفروضہ ہاتھ آجاتا ہے جس کی صحت کے متعلق ہمیں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ جب تک ہمیں صحیح مفروضہ نہیں ملتا ہم حقایق

ایک غلط مفروضہ کی لڑی میں پروئے رکھتے ہیں اور ہماری تحقیق غلط رہتی ہے. جدید علم طبعیات کے حقایق ایسے ہی صحیح یا غلط مفروضات پر مبنی ہیں حتی کہ وہ حقایق بھی جن کی مدد سے ہم نے سالمہ کو شق کیا ہے اور جن کی صداقت سالمہ کے انشقاق سے پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے ڈارون کا مادی میکانیکی (Mechanical) نظریۂ ارتقا بھی ایک ایسا ہی مفروضہ ہے جسے مغرب کے اکثر حکما نے انسانی اور حیاتیاتی علوم کی تحقیق کا نقطۂ آغاز بنایا ہے چونکہ یہ مفروضہ غلط تھا اس لئے ان علوم میں مغربی حکماء کی تحقیق کے سارے نتائج غلط ہو گئے ہیں اس کے برعکس اگر ہم اسلامی نظریۂ کائنات کو ایک مفروضہ سمجھ کر اس مفروضہ سے ان علوم میں اپنی تحقیق کا آغاز کرینگے تو ہم صحیح نتائج پر پہنچیں گے. کیونکہ ہمارا مفروضہ صحیح ہوگا. ایک لفظ میں اسلامی نظریہ کائنات جو ہماری علمی تحقیق کا نقطۂ آغاز ہوگا یہ ہے کہ خدا انسان اور کائنات کا خالق ہے اور ایک مدعا کے ماتحت قول کن سے غیر مبدل قوانین کی تخلیق کرتا ہے،

لا یبدل القول لدی

ترجمہ:۔ میری بات بدلتی نہیں ہے.

یہ مفروضہ ہمیں علمی تحقیق میں ان غلطیوں سے بچائیگا جن کی وجہ سے انسانی اجتماعی اور حیاتیاتی علوم میں بالخصوص حکمائے مغرب کی تحقیق مضحکہ خیز بن گئی ہے خودی کائنات علم کی ابتدا اور انتہا ہے جو حکیم اپنی علمی تحقیق کا آغاز یہاں سے نہیں کرتا وہ لازماً کسی اور مفروضہ سے اس کو آغاز کرے گا. اور پھر چونکہ اس کی خشت اول ہی غلط ہوگی اسکی تحقیق کی دیوار اگر ثریا تک بھی جائے گی تو ٹیڑھی ہی رہے گی.

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا نظام تعلیم علمی اور عقلی لحاظ سے صحیح ہو تو ضروری ہے کہ اس کی بنیاد صحیح ہو اور صحیح بنیاد اسلامی نظریۂ کائنات کے سوائے اور کوئی نہیں ہو سکتی. فی الواقعہ اسلامی نظریۂ کائنات علم ہے اور علم کی مختلف شاخیں اسکی

مختلف شاخیں ہیں۔ جو نظریۂ کائنات بھی صحیح ہوگا وہی علم ہوگا اور علم کی مختلف شاخیں اس کی شاخیں ہوں گی۔

روس کی مثال

اس بارہ میں ہمیں روس کے کفار سے سبق لینا چاہیئے۔ روسیوں کا نظریۂ کائنات جدلی مادیات (Dialectical Materialism) کہلاتا ہے

روسی جدلی مادیات کو صحیح سمجھتے ہیں اور لہٰذا روسیوں نے اس کو علم اور علم کی تمام شاخوں کو اس کی شاخیں قرار دیا ہے وہ توقع رکھتے ہیں کہ علم کے ہر شعبہ میں جو نئے انکشافات ہونگے وہ فلسفہ جدلی مادیات کی تائید کرینگے جب ایسا نہیں ہوتا۔ تو وہ سائینسدان پر الزام عائد کرتے ہیں کہ جدلی مادیات کے مذہب پر اس کا یقین پختہ نہیں۔ اور اس کا ضعف اعتقاد اس کے بہکنے کا موجب ہوا ہے لہٰذا وہ اسے قابل تعزیر سمجھتے ہیں اور اس کی تعزیر اکثر اوقات موت ہوتی ہے ہم سائینسدان کو تعزیر کرنے کی حد تک تو نہ جائیں۔ کیونکہ ہمیں یقین ہے اگر کسی وقت ایک سائینسدان کی تحقیقات کے نتائج اسلام کے حق میں نہیں ہونگے تو دوسرے سائینسدان کی تحقیقات سے بالآخر اس کی غلطی کا ازالہ ہو جائیگا لیکن ہمیں یہ محسوس کرنا چاہیئے کہ علم درحقیقت اسلامی نظریۂ کائنات کا نام ہے اور اس غلط نظریۂ کائنات کا نام نہیں جسے جدلی مادیات کہا جاتا ہے اور یہ ہمارا ہی حق تھا۔ جسے روسی ناجائز طور پر کام میں لائے ہیں

پری نہفتہ رخ و دیو در کرشمہ و ناز
بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست!

روسی نہ صرف جدلی مادیات کو اپنے نظام تعلیم کی اساس قرار دیتے ہیں بلکہ اس فلسفہ کو اسکولوں اور کالجوں میں ایک الگ مضمون کے طور پر بھی پڑھاتے ہیں جو لازمی ہوتا ہے بلکہ وہاں کوئی شخص اسوقت تک ریاست کی اعلےٰ ملازمتوں میں نہیں لیا جاتا۔ جب تک کہ وہ ایک ایسے امتحان میں شامل ہو کر کامیاب ہو جس میں جدلی مادیات ایک لازمی مضمون ہے

جو امیدوار اس مضمون میں ناکام ہو جاتا ہے وہ سارے امتحان میں ناکام سمجھا جاتا ہے۔

مارکسی فلسفہ کی مدرسی کتاب (A Text Book of Marxist Philosophy)

کو روس کے بڑے بڑے علماء جدلی مادیات نے مل کر مدون کیا ہے اس کے مصنفین

کتاب کے دیباچہ میں فلسفۂ جدلی مادیات کی تعلیم کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

روسی جانتے ہیں کہ ایک انسان کا نظریہ کائنات اہمیت رکھتا ہے اور وہ لوٹ

کھسوٹ اور طلب منفعت کے پیچھے ایک مثبت قوت کے طور پر موجود ہو سکتا ہے،

تم سماجی مرض کا ازالہ اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک کہ اپنی سیاسی اور صنعتی تجاویز

کے ساتھ ساتھ سرمایہ داری نظریہ کائنات کی تردید نہ کرو اور اس کے عوض میں کوئی دوسرا

نظریہ کائنات بہم نہ پہنچاؤ وہ جس نظریہ کا انکار کرتے ہیں انہیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے

اندر کیا کیا مغالطات ہیں۔ اور ان کے پاس ان کا اپنا نظریہ کائنات ہوتا ہے،

جو ہر چیز کو دیکھنے کے لئے انہیں روشنی بخشتا ہے ...... ایک روسی چیسٹرٹن

(Chesterton) کے ساتھ متفق ہے کہ عملی نقطہ نگاہ سے ایک انسان کے بارہ میں اہم

ترین چیز اس کا نظریہ کائنات ہے ...... تاریخ میں کوئی بڑی تحریک ایسی جاری نہیں

ہوئی جو ایک فلسفیانہ تحریک نہ تھی عظیم الشان نظریات کائنات کے وجود میں آنے کا

وقت ہی عظیم الشان نتائج کے وجود میں آنے کا وقت ہوتا رہا ہے، کوئی شخص فلسفہ

کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ جو شخص سمجھتا ہے۔ کہ وہ فلسفی نہیں وہ درحقیقت ایک اچھا

فلسفی نہیں،،

یہی نقطۂ نظر ہمیں اسلامی نظریہ کائنات کے متعلق اختیار کرنا چاہیئے "

الحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ تتم الصٰلحٰت

صحیح[؟] قریشی فصیح الدین جمیل

جدید مطبوعات

★

انگریزی

		روپے	آنے
۱-	اسلامک آئیڈیالوجی (مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ایم-اے ایل ایل بی - پی ایچ ڈی)	۱۰	۰
۲-	فنڈیمنٹل ہیومن رائٹز (مصنفہ ,, ,,)	۰	۸
۳-	دی فیلیسی آف مارکسزم (مصنفہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم-اے پی ایچ ڈی)	۰	۱۲
۴-	محمد دی ایجوکیٹر (مصنفہ رابرٹ گللک)	۳	۰
۵-	اسلام اینڈ تھیوکریسی (مصنفہ محمد مظہرالدین صدیقی)	۱	۸
۶-	ویمن ان اسلام (مصنفہ محمد مظہرالدین صدیقی)	۵	۱۲
۷-	اسلام اینڈ کمیونزم (مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ایم-اے - ایل ایل بی - پی ایچ ڈی)	۸	۰

اردو

		روپے	آنے
۸-	عقائد و اعمال (مصنفہ محمد مظہرالدین صدیقی)	۰	۱۲
۹-	اسلام میں حریت۔ مساوات۔ اخوت (مصنفہ خواجہ عباد اللہ اختر).	۱	
۱۰-	اسلام اور حقوق انسانی (مصنفہ خواجہ عباد اللہ اختر بی-اے)	۱	۴
۱۱-	اسلام کا معاشی نظریہ (مصنفہ محمد مظہرالدین صدیقی ایم-اے)	۱	۸
۱۲-	دین فطرت (مصنفہ محمد مظہرالدین صدیقی ایم-اے)	۱	۸
۱۳-	اسلام کی بنیادی حقیقتیں (مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم و دیگر رفقائے ادارہ)	۲	۸
۱۴-	اسلام کا نظریہ تعلیم (مصنفہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین)	۱	۰
۱۵-	اسلام کا نظریہ اخلاق (مصنفہ مظہرالدین صدیقی ایم-اے)	۱	۱۲
۱۶-	علم تصوف (مصنفہ خواجہ عباد اللہ اختر بی-اے)	۲	۰

P.T.O.

کتاب	آنے	روپے
۱۷- مقام سنت (مصنفہ مولانا جعفر شاہ پھلواروی ندوی)	۰	۲
۱۸- خلافت اسلامیہ (مصنفہ خواجہ عباد اللہ اختر)	۸	۵
۱۹- اصول فقۂ اسلامی - حدود اللہ و تعزیرات (مصنفہ خواجہ عباد اللہ اختر)	۸	۲
۲۰- اسلام کا نظریہ تاریخ (مصنفہ محمد مظہرالدین صدیقی)	۰	۳
۲۱- تہذیب و تمدن اسلامی (حصہ اول) (مصنفہ رشید اختر ندوی)	۰	۵
۲۲- تہذیب و تمدن اسلامی (حصہ دوم) (,,)	۸	۶
۲۳- مسئلہ اجتہاد (مصنفہ مولانا محمد حنیف ندوی)	۸	۲
۲۴- قرآن اور علم جدید (مصنفہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم-اے - پی ایچ ڈی)	۸	۵
۲۵- بیدل (مصنفہ خواجہ عباد اللہ اختر بی-اے)	۸	۶
۲۶- فقۂ عمر (مصنفہ مولانا ابو یحییٰ امام خان)	۰	۴
۲۷- افکار ابن خلدون (مصنفہ مولانا محمد حنیف ندوی)	۸	۳
۲۸- ریاض السنت (مصنفہ مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی ندوی)	۰	۸
۲۹- افکار غزالی (مصنفہ محمد حنیف ندوی)	۰	۵
۳۰- مسئلہ زمین (مصنفہ پرنسپل محمود احمد صاحب ایم-اے)	۸	۳
۳۱- الدین یسر (مصنفہ مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواروی ندوی)	۰	۵
۳۲- طب العرب (مصنفہ حکیم سید علی احمد نیر واسطی)	۰	۶
۳۳- تہذیب و تمدن اسلامی حصہ سوم (مصنفہ رشید اختر ندوی)	۱۲	۵
۳۴- حکمت رومی (مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ایم-اے-ایل ایل بی پی ایچ ڈی)	۰	۳
۳۵- مذاہب اسلامیہ (مصنفہ خواجہ عباد اللہ اختر)	۰	۵
۳۶- اسلام میں حیثیت نسواں (مصنفہ محمد مظہرالدین صدیقی)	۰	۳
۳۷- ازدواجی زندگی کے متعلق اہم قانونی تجاویز (مصنفہ مولانا سید محمد جعفر شاہ صاحب ندوی پھلواروی	۱۵	۰
۳۸- اسلام کا فکری نظام - اردو ترجمہ اسلامک آئیڈیالوجی (از محمد قطب الدین صاحب حیدرآباد - دکن)		
۳۹- اسلام اور رواداری - از مولانا رئیس احمد صاحب جعفری - ندوی -		

★

ادارہ ثقافت اسلامیہ

کلب روڈ - لاہور